قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فہو منہم

الحمد للہ کہ شرح حدیث مذکور مسمی بہ

جس میں مسئلہ تشبہ بالکفار کی اہمیت اُس کی شرعی و عقلی حیثیت اُس کے منشا و ماخذ [illegible]
پھر اس کے قدرتی نتائج پر عقل سلیم اور نقل صحیح سے روشنی ڈالی گئی ہے [illegible]
کے تمام اُصولی اور فروعی شبہات کا استیصال کیا گیا ہے

مصنفہ

جوان صالح عالم باعمل مولانا الحافظ الحاج القاری محمد طیب صاحب مدظلہ نائب مہتمم
دارالعلوم دیوبند ابن حضرت مولانا الحافظ الحاج محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نبیرہ
حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہ

باہتمام

مولوی قاری محمد طاہر صاحب

مطبع [illegible] قاسمی [illegible] دیوبند [illegible]

فہرست مضامین التشبہ فی الاسلام

اور حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا الحاج قبلہ ارباب رشد وہدایت آیۃ من آیات اللہ العظیم رحمۃ اللہ تعالیٰ شیخ العالمین محمد قاسم
النانوتوی قدس اللہ سرہٗ کے پوتے مولوی قاری حافظ الحاج محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے اسم گرامی پر نکلا جس جماعت حقہ
کے اصاغر ایسے اسکے اکابر کیسے الشجرۃ تنبئ عن الثمرۃ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کی عمر وصحت علم وعمل اخلاق حسنہ اور فیوض
ظاہریہ وباطنیہ مراتب علیہ میں روز بروز ترقی عطا فرمائے اور ان کو حضرت قاسم العلوم والخیرات قدس سرہٗ کا صحیح جانشین بنادے
اور اس کتاب کو مقبول خاص وعام بنا کر اہل اسلام کو اس سے مستفید فرمائے آمین مسلمان اور بالخصوص ناظرین حضرات اسکو بہ نگاہ
شکر مسلمانوں کو اسکے مضامین عالیہ حقہ سے مستفید فرما کر عزیز مصنف اور دارالعلوم دیوبند کو دعائے خیر میں یاد فرمائیں۔ آخر میں
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کتاب کے دوسرے حصے اور مصنف موصوف کے دوسرے مفید رسائل کے فیض سے بھی مسلمانوں کو
جلد متمتع فرمائے آمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ ونور عرشہ وسید انبیاءہ
وسلم وآلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ؛

تقریظ از حضرت مولانا الحاج السید اصغر حسین صاحب دامت برکاتہم محدث دارالعلوم

حامداً ومصلیاً۔ احقر نے اپنے عزیز گرامی قدر مولانا محمد طیب صاحب کا علمی رسالہ نہایت غور سے پڑھا طبیعت کو نہایت مسرت
ہوئی اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ مولانا کو ایسے فیوض علمیہ سے مالا مال فرمایا اور نشر واشاعت کی توفیق دیکر اہل علم کے لئے حظ اور
دیگر حضرات کے لئے سامان ہدایت میسر فرمایا۔ کتبہ الفقیر اصغر حسین عفا اللہ عنہ

مدرس دارالعلوم دیوبند

تقریظ از حضرت مولانا الحافظ محمد اعزاز علی صاحب دامت برکاتہم

صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امّا بعد زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ بعض دوست نما دشمن اور ان
دوست ہیچکے تمدن سے متاثر ہوکر اسلام اور غیر اسلام کی اس درمیانی خلیج کو پاٹنے لگے تھے جو بہت زیادہ وسعت کے ساتھ دونوں
میں حائل تھی اور جس کیوجہ سے تھوڑی سی توجہ کے بعد انسان اسلام اور غیر اسلام میں امتیاز کر سکتا تھا۔
انوار رحمت نہ بھرسے بہر ذات عالم اس مقدس ذات کی قبر کو جس کے مساعی نے آج تمام عالم کو انوار علوم دینیہ سے منور کیا
ہے۔ اور جسکو ہم آج حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کہا کرتے ہیں۔

اس مقدس ہستی نے دنیا میں رہکر اگر ایک طرف غیر مسلموں کے شکوک کا ازالہ کیا تو دوسری طرف ان اندرونی اعداء کے عقائد فاسدہ اور اعمال منکرہ کی تشنیع بھی کی۔ اس مخلصانہ اور حسبۃً لوجہ تعالیٰ شانہ مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ منکرات کی یہ بڑھتی ہوئی رَو یکایک رک گئی اور یہ سیلاب عظیم خدائی بند ہی کے سامنے سرنگوں ہو نے لگا۔ اس موجودہ دور میں انھیں عقائد فاسدہ اور اعمال منکرہ کی اشاعت مقدم الذکر اصحاب کی روحانی اولاد نے پھر شروع کی اور یہی اسلحہ اسلام کے استیصال کے لئے استعمال کئے جو ان کو اپنے روحانی موروثوں سے ترکہ میں ملے تھے۔

قادر مطلق مدارج دارین بلند کرے۔ جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب کے جنھوں نے اس قرض کو باحسن وجوہ اس رسالہ کی صورت میں ادا کیا جو انھوں نے حضرت ممدوح الصدر کے نبیرہ ہونے کی حیثیت سے دفاع عن الاسلام کے متعلق عائد ہوتا تھا اور اسی لئے میرا دل چاہتا تھا کہ مورث اور وارث کی دونوں جماعتوں کی مدح میں عرب کے شاعر کا یہ شعر پڑھدوں۔

فکلکم الی مالی ابیہ		فکل فعال کلکم عجاب

بلاشبہ تشبیہ غیر المسلم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہو کہ جسپر اسلامی اصول وفروع کا بہت زیادہ مدار ہو اور یہ ہو انستطیع مخالفین اسلام اسکی اہمیت کو کم کرنیکی ہمیشہ کوشش کی ہے اور علمانے اسپر روشنی ڈالی ہو۔ موجودہ حالت میں کہ یورپ کی طمع سازیاں زیادہ سرعت کے ساتھ قدم آگے بڑھا رہی ہیں، ضرورت تھی کہ دلچسپ انداز میں اسلام کے چہرہ سے اس گرد و غبار کو دور کردیا جائے الحمد للہ کہ یہ ضرورت اس تصنیف نے پوری کردی۔

میں نے اس رسالہ کا بہت سا حصہ مختلف مقامات سے متفرق اوقات میں دیکھا اور سچ یہ ہے کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا ہو کہ میں کن الفاظ سے اس رسالہ کی مدح سرائی کروں۔ معمولی الفاظ بجائے مدح کے ذم کی صورت اختیار کرینگے اور اگر پوری تعریف کردیتا تو یہ دشواری ہوگی کہ لوگ کہینگے کہ مقرظ متملق ہے اور میں خیال کروں گا کہ میں اب بھی ناقص تک پہونچ سکا ہے۔

الیس عجیبا ان وصفک معجز		وان لسانی فی معالیک تکلم

اس لئے اس کا ارادہ ہی ترک کرتا ہوں اور مصنف کے لئے دعا کرتا ہوں کہ خدایا! اس علمی نونہال کو علماً وعملاً آئندہ اور آگے قدم بقدم رکھ۔ اور تشنگان علم کو اس جدول علمی سے سیراب فرما۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد اعزاز علی عفی عنہ مدرس دارالعلوم دیوبند

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمۃ الکتاب

وجہ تصنیف اور مصنف کی چند ضروری گذارشیں

دنیا میں قوۃ وشوکۃ جس چیز کا ساتھ دیتی ہے وہ قدرتی طور پر عالم کیلئے نظر فریب اور دلپذیر بن جاتی ہے۔ کسی خوبی اور کمال ہی پر منحصر نہیں، بڑے بڑے امور اور فواحش ومنکرات بھی جب شوکۃ وقوۃ کی حمایت میں بسیط اور پر نمایاں ہوتے ہیں تو عامۃ الناس کی توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور اسی کے بالمقابل کسمپرسی تنگدستی اور مغلوبیت وناتوانی وہ مہلکہ عظیمہ ہے کہ بھلی سے بھلی چیز کو بھی عام طبائع کے لئے حقیر اور ناقابل التفات بنا دیتی ہے۔

اسلامی تمدن جسکی بنیاد سادگی۔ زہد وقناعت۔ تدین وخدا پرستی اور سنن نبوۃ پر قائم تھی جبکہ ہماری شامت اعمال کی بدولت شوکۃ وقوۃ نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تو شوکۃ پرست طبیعتوں نے بھی اُس سے منھ موڑ لیا اور اسکے مٹنے کی نوبت آنے لگی۔ اُسمیں ہزاروں معائب پیدا ہوگئے اور پرایوں سے زیادہ اپنوں ہی کیلئے وہ ناقابل التفات اور قابل نفرت چیز بن گیا۔ اور ٹھیک اس کے بالمقابل وہ انگریزی تمدن جسکا منشا یقیناً کوئی طریق نبوۃ اور خلق ربانی نہیں بلکہ اسکی بنیاد تلذذ وتعیش اور نفس پروری وتن آسانی پر قائم کی گئی ہے جبکہ حکمرانی اور شوکت کے زیر سایہ تربیت پاکر پروان چڑھا تو آج اُس نے اپنے اندر کتنی رعنائی و دلربائی پیدا کرلی، اسکا نظر فریب شباب کس درجہ جاذب قلوب بنگیا اور اس نے سرزمین ہند کے نونہالوں میں سے کس قدر ایسے عاشق پیدا کر لئے جو اُس پر جان ایمان نثار کر دیتے ہیں بھی کوئی عذر نہیں رکھتے۔ وہ اسکی ہر بری سے بری خصلت اور اسکے شنیع سے شنیع رویہ کا محض اسلئے پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس کی ساتھ غلبہ وتسلط کی نمود ہے۔

قوۃ وصنعت کے اس ادنیٰ تبدل نے مشرق ومغرب کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا اور تہذیب یورپ اور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

این رہ منزل قدس است میندیش بیا		بل ازیں راہ خطا باشد ہمیں تاکی

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد وعلی آلہ واصحابہ
وازواجہ وذریاتہ واتباعہ اجمعین، اما بعد

انقلاب اُمم

دنیا میں سیکڑوں قانون بنے اور بگڑے۔ ہزاروں آئین مرتب ہوئے اور پھر مٹ گئے۔ مگر وہ ایک قانون جس نے ابتدائے آفرینش سے آجتک کبھی تغیر و انقلاب قبول نہ کیا وہ قانون انقلاب ہے۔

اس انقلاب و تغیر کی دسترس سے کائنات کا کوئی جوہر و عرض، و کیفیت و کم امن نہیں پا سکا۔ زمانہ اور زمانیات مکان اور مکانیات کو کبھی اس قانون نے مہلت نہ دی کہ وہ ابد قرار یا کسی ایک حالت پر قائم رہ سکیں۔ ارضیات کو دیکھو تو تعمیر و تخریب شکست و ریخت بدل سدل اور فنا و بقا نے پھر سماویات کو لو تو ادوار و اطوار ایاب و ذہاب۔ گردش و دوران اور الٹ پھیر کی متضاد کیفیات نے ان کے ہر ہر ذرہ کو اپنی زنجیروں سے جکڑ دیا ہے۔

وہ اشرف ترین نوع (انسان) جس نے تمام کائنات ارضی و سماوی پر فضیلت کا دعوی کیا ہے اس کا بھی کوئی فرد اور کوئی مجموعہ پھر اس کی ہر ہر حالت انفرادی ہو یا اجتماعی ان دہری انقلابات عروج

و نزول اور رفعت و پستی سے مامون نہ رہ سکی۔

کبھی یہ ظلوم و جہول حزوم و ہمت لیکر اوج سعادت کی طرف اٹھتا ہے تو طائران قدس بھی اسکی پرواز سے نیچے ہی دھرے رہجاتے ہیں اور کبھی یہی پاکباز انسان پستی و دناءت کے سبب حضیض ذلت کیطرف گرتا ہے تو عالم کی ہر ذلیل سے ذلیل چیز اس سے اچھی اور برتر معلوم ہونے لگتی ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین ۔	ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے پھر ہم اسکو پستی کی حالت والونسے بھی پست تر کر دیتے ہیں

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم	گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

غرض اس اشرف الکائنات کے سکون و قرار کا سر بھی تغیر و انقلاب کے بارے کبھی ہلکا نہ ہو سکا۔

زمانہ کی تلون مزاجیاں اور تغیر پذیر رفتاریں ہمیشہ ایسے انقلابات پیش کرتی رہی ہیں اور کائنات عالم کا کرہ ہمیشہ گیند کی طرح اس کے چوگان تلون سے لڑکتا رہا ہے۔ اس نے کتنے ہی راجیوں کو جنہوں نے برسوں خدا کی مخلوق پر جبروت سے حکمرانی کی ایک ذلیل رعیت کی حیثیت میں پیش کیا اور کتنے ہی سروں کو جن پر عزت کے تاج رکھے گئے۔ ذلت و خواری کی ٹھوکروں کے قابل بنا دیا۔

زمانہ کی روشن مثالی جب اپنا چہرہ بے نقاب کرتی ہے تو سگ اصحاب کہف عزت و شرف میں بنی آدم کے دوش بدوش نظر آنے لگتا ہے۔ اور زمانہ ہی کی تصویر جب اپنا تاریک اور بدنما پہلو سامنے کرتی ہے تو ایک جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر (نوح ؑ) کا بیٹا اہل نار کے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ اور خاندان نبوۃ کو داغدار بنا دیتا ہے۔

پسر نوح با بداں بنشست	خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند	پئے نیکاں گرفت مردم شد

پھر نہ صرف اشخاص بلکہ دنیا کی اگلی اور پچھلی تمام اقوام اسی قانون تغیر و انقلاب اور ضابطۂ عدوث و تجدد کے سامنے سرخم کئے ہوئے گذریں اور گذرتی رہینگی۔ کتنی ہی اولوالعزم قومیں تاج و تخت کے جبروت کے ساتھ افق عالم پر چمکیں اور دنیا کی نگاہوں کو انہوں نے اپنے سطوت و جلال سے خیرہ

کر دیا لیکن پھر انہی سطوت و اقتدار کے مالکوں کو قانون انقلاب کے ہاتھوں نے کائنات کے دنگل میں اس طرح پچھاڑ دیا کہ پھر وہ قومیں کبھی نہ ابھر سکیں۔

وہ قوم جس نے من اشد منا قوۃ کا نعرہ بلند کیا۔ وہ قومیں جنھوں نے اپنی فوق العادۃ صناعیوں سے پہاڑوں کو موم کی طرح تراشا اور ان میں بیوت لمساکن بنائے و عمروھا اکثر مما عمروھا اور وہ قومیں جن کی بے مثال دماغی اور علمی جولانیوں کی تاریخ آجتک دنیا کو حیرت و استعجاب کی دعوت دے رہی ہے یعنی عاد۔ ثمود۔ اصحاب مدین اور کلدانی قومیں دنیا میں زبردست اقتدار کی ساتھ آئیں۔ ترقی اور نئے نئے ایجادات کی ساتھ آئیں۔ لیکن جبکہ ان کے وسیع طاقت کے گھمنڈ نے متاع دنیا کی بغض پرور طلب حظوظ نفسانی کی ہوسناک مانگ اور استمتاع خلاق کی مستقیانہ آرزو پر اٹھیں اور دماغوں کو مست غرور و پندار کر دیا تو سنت جاریہ کے موافق قدرۃ کا وہی انقلابی پنجہ نمودار ہوا اور اسنے ان کے عروج و اقبال کو ایسا حرف غلط کی طرح مٹایا کہ آج سطح زمین پر کوئی نقش قدم بھی نکا پتہ دینے والا نہیں۔

فهل ترى لهم من باقية؟ کیا تم کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے؟

هل تحس منهم من احد او تسمع لهم ركزا؟ کیا آپ انہیں کسی کو دیکھتے ہیں؟ یا انکی کوئی آہٹ آواز سنتے ہیں؟

پس اس کارزار انقلاب میں تمکین و قرار کے کتنے ہی مسافر یکے بعد دیگرے آئے اور اپنی اپنی باری سے تخت اقبال پر متمکن ہوئے۔ پھر آخر کار انقلاب کی آویزش سے اپنی اجل معلوم پوری کی اور دوسروں کے لئے جگہ خالی کر گئے۔

یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

وتلك الأيام نداولها بين الناس۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان میں ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔

اسلامی قوم کا انقلاب صحت و مرض

آج بھی اسی قانون انقلاب کا تماشا دیکھو۔ اور دیدۂ اعتبار سے دیکھو کہ یہی جلیل القدر اور خیر الامم امۃ اسلامی امت پر ایک دن زمانہ بھی آچکا ہے جبکہ اس کا ایک ایک فرد سعادت و برکات کی زندہ تصویر اور خود وجود بھی دینداری کی زندہ یادگار تھا۔ دنیا میں ان کی مثالیں ہاتھ نہ لگتی تھیں اسلئے کہ وہ

اپنی مثال خود ہی تھی۔ قومیں ان سے لرزتی تھیں تاج و تخت کے مالک ان سے تھراتے تھے اور ان کے نام سے بڑے بڑے مغرور دماغ ڈھیلے پڑجاتے تھے اسلئے کہ قوۃ و شوکت ان کے قدموں میں تھی اقبال ان کے آگے آگے تھا اور وہ ناکامی و تنزل کو پس پشت پھینکتے ہوئے فوز و فلاح کیطرف بڑھتے چلے جارہے تھے لیکن آہ کہ آج اسی درخشاں قوم کے افراد ہم جیسے تاریک دل ناکام تمنا اور محروم اقبال انسان ہیں۔ وہ انسان کہ انسانیت ان سے شرما رہی ہے اور مکارم اخلاق کو ان سے ننگ رہا ہے ع

ابتداء وہ تھی انتہا یہ ہے

ماضی کے سامنے مستقبل کو شرمانا پڑ رہا ہے، آہ کہ جو بزم ہمیشہ بادہ بجام رہی ہے آج آتش بجام نظر آتی ہے

در مجلسے کہ یاراں شرب مدام کردند
چوں نوبت بما شد آتش بجام کردند

اُمت اسلام کے سر پر جبکہ ایک مبارک عہد نے اپنا ظل ہمایونی ڈالا تو وہ اتنی خوددار اور باجبروت ہوئی کہ اس کی جبروت انگیز طاقت نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ عالم کی حکمرانیوں کے نقشے بدل دیئے اور دنیا کی کایا پلٹ دی۔ اور اسی قوم پر جبکہ اس نامبارک قرن نے اپنا سایہ ڈالا تو وہ اتنی بے وزن اور محروم وقار ہوگئی کہ آج دنیا نے بلکہ اس کا نقشہ بدل دیا اور اقوام عالم نے تو دنیا کی کایا پلٹ دی۔

بیدہ المیزان یرفع بہ اقواما و یضع بہ آخرین	اسی کے ہاتھ میں میزان ہے کبھی قوم کو اس قرآن کے ذریعہ بلند کر دیتا ہے اور کسی کو پست

آں بزم عیش یک دو قدح درکشید و رفت
ایں صبح ماند و [illegible]

اس زبردست قوم کا ماضی و حال ہمارے سامنے ہیں ایک طرف تو وہ قدیم سکون و طمانیت کی ہمتیں ذہن و دین و سعادت کی سب بلندیاں اور جاہ و جلال کے سب ارفع مناظر ہمارے سامنے ہیں جن کو ماضی قریب ہی میں اس قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور دوسری طرف فلاکت کے ننگ اور طوفان تباہی کے پیاپے جھونکے۔ اور اضطراب کے غیر مختتم فتنے بھی ہمارے پیش نظر ہیں جو حال میں اس قوم پر ہجوم کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے تحیر و استعجاب کی اس وقت کوئی حد باقی نہیں رہتی

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بلند پرواز ترقی پذیر، اور طوفان کی طرح بڑھنے والی قوم کو زمانہ کی جفاکاری کس سرعت کے ساتھ پستی کیطرف پٹک دیتی ہے۔ اور کس طرح ایک شدید القوی، صحیح المزاج اور دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ تندرست قوم بتدریج کچھ ایسے ضعف ونقاہت۔ فساد مزاج اور گوناگوں امراض کے بھنور میں گھر جاتی ہے کہ اس کے آخر کو اسکے اول سے نسبت ہی نہیں رہتی۔ امت کے یہ دونوں متضاد دور ہمارے سامنے ہیں۔ اور ہم اس ہمہ حیرت انقلاب، ترقی وتنزل۔ ارتقاء وانحطاط، رفعت وپستی اور سربلندی ونگونساری کے متضاد مدارج پر اسلئے غور کررہے ہیں کہ ان کے اسباب وعلل کے متعلق کوئی صحیح اور وزنی رائے قائم کریں۔

قوم کے مرض کی تشخیص

تفتیش اسباب کے میدان میں اتر کر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ایک ہم ہی نہیں بلکہ امت کے سیکڑوں قابل اور مغز دماغ اسی تگ ودو اور سراغرسانی اسباب میں اپنی پوری ہمت وطاقت کیسا تھ لگے ہوئے ہیں اور مفتشوں کی کثرت سے اس حیثیت پا افتادہ قوم کی مثال جیسے اس مریض کی سی ہوگئی ہو جس کے ہر بن موہ میں مرض سرایت کرچکا ہے گوشت پوست اور ہڈیاں تک سوکھ گئی ہیں، رنگ زعفرانی ہے قوی معطل اور ہاتھ پیر جواب دیچکے ہیں۔ قوم کے ہونہار طبیب اور ماہر ڈاکٹر بالین قوم پر جمع ہیں۔ تاکہ مرض اور اسکے حقیقی اسباب کی تشخیص کریں۔ اور پھر ازالۂ اسباب کے ذریعہ استیصال مرض کی تدابیر عمل میں لائیں۔

ہر ایک نے اپنے اصول فکر اور پرواز عقل کے مطابق اسباب مرض کو سمجھا اور علاج تجویز کیا۔ کسی نے قوم کا حقیقی مرض تنگدستی وافلاس کو سمجھا اسلئے اسنے تجویز کیا کہ قوم کو دولت مند بننا چاہیے۔ اور دولت کی فراہمی کے ذرائع تجارت۔ زراعت حتی کہ سودی لین دین اور بوی بینک بے دریغ استعمال کرنے چاہئیں۔ کسی نے کہا کہ اصل مرض جہالت ہے۔ اور اس کی دوا کالجوں اسکولوں کی چہار دیواری میں مل سکتی ہے۔ کسی نے کہا کہ اسکی بیماری غلامی ہے جب تک کہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر شوکت ورفعت اور حریت وآقائی کا تاج اسکے سر پر نہ رکھدیا جائے۔ قوم نہیں پنپ سکتی۔ کسی نے

بتلایا کہ اسکی صحت کو نفاق و شقاق کے جراثیم نے کھو دیا ہے۔ جبتک کہ قوم میں اتحاد کی لہر نہ دوڑا دیجائے مریض کے چہرے پر کبھی صحت کی بشاشت نمایاں نہیں ہو سکتی۔ کسی نے کہا کہ اسکے ایوان صحت کو بیکاری نے ویران کر دیا۔ اور اس میں تشویش و تشتت افکار کا ضعف پیدا کر دیا ہے۔ جبتک کہ صنعت و حرفت اور دوسرے کار آمد شغلوں سے اسکی تعمیر نہ ہوگی۔ قوم کی گئی ہوئی جمعیت اور یکسوئی (جو صحت کی اساس ہے) واپس نہیں آسکتی۔

بہرحال ہر ایک بہی خواہ نے دردمندانہ طریق پر اپنے جذبات اصلاح کو سامنے رکھکر تشخیص مرض اور تجویز علاج کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقیقت تک انمیں سے کوئی بھی تو پہنچ سکا۔ ان ظاہر بین اور سطح نظر اطباء کی نگاہیں مرض کے صرف ظاہری اسباب میں الجھ کر رہ گئیں۔ اور اسباب کی تہ یا علۃ العلل تک انکی رسائی نہ ہوئی۔ وہ یہ تو دیکھ سکے کہ قوم میں پستی کے نمایاں اسباب افلاس۔ غلامی۔ جہالت۔ نفاق (اور انہی کے ہم معنی اور بہت سے الفاظ) ہیں لیکن اسطرف ان کا مرکب عقل نہ دوڑ سکا کہ یہ اسباب بھی تو بہرحال حوادث ہی ہیں اور جبکہ ہر حادثہ کے لئے سلسلۂ اسباب میں کسی سبب کی ضرورت ہے تو پھر یہ اسباب آخر کس سبب کی بنا پر امت میں نمایاں ہوئے۔ اور ان اسباب کی تہ میں وہ کونسا اندرونی سبب ہے جو مخفی طور پر اس قسم کے مہلک اسباب کی نمائش کر رہا ہے؟

مانا کہ افلاس پستی کا سبب ہے۔ لیکن پھر افلاس کا کیا سبب ہے۔ اور وہ کیوں پیدا ہوا؟ یہ بھی تسلیم کہ غلامی قومیت کے لئے مخرب ہے لیکن آخر غلامی کس سبب کی بدولت [illegible] جانتے ہیں کہ جہل و نفاق اسباب ذلت و مسکنت ہیں لیکن پھر کس راہ سے یہ جہالت و نفاق [illegible] قوم میں دخیل ہو گئے؟ یہ بھی صحیح کہ بیکاری تشویش و تشتت اور پراگندگی کا سبب ہے لیکن آخر بیکاری نے ان کار آمد اشغال کی جگہ کیوں سنبھال لی؟ پس جبکہ ان تمام اطباء [illegible] اندرونی اور مخفی دشمن کا پتہ نہ لگا سکا [illegible] تشخیص ہی پایۂ اعتبار تک نہ پہنچ سکی، چہ جائیکہ انکی تجویز علاج قابل عمل ہو۔ اور جبکہ تشخیص و تجویز دونوں ہی مخدوش ہوں تو ایسے [illegible] سے کس طرح شفا یابی مریض کی توقع باندھی جاسکتی ہے

یہی وجہ ہے کہ مریض روز بروز بقا سے دور اور فنا سے نزدیک تر ہوتا جا رہا ہے۔

گشت بیمار و کہ ایشان کردہ اند
بے خبر بودند از حال درون
ہر چہ کردند از علاج و از دوا

آن عمارت نیست ویران کردہ اند
استعیذ اللہ مما یفترون
رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

پس جبکہ ان اطبا ظاہر کی تمام تدابیر تاحال بے سود ثابت ہوتی رہیں تو آؤ ہم سب ملکر ان باطنی اطبا کی طرف رجوع کریں جو امراض کے تحتی اور تحتانی اسباب پر براہ راست حضرت مسبب الاسباب جل مجدہٗ کی طرف سے مطلع ہو کر تمام پیچیدہ امراض کے حقیقی بواعث کا نہایت سہولت سے پتہ لگا لیتے ہیں۔ اور جن کے کامیاب علاجوں سے کتنی ہی مردہ اقوام نے دوبارہ جنم لیا اور زندگی سے متمتع ہونے لگیں۔ پھر ان میں سے بھی بالخصوص اس سرخیل اطبا روحانی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامیاب مطب کی دہلیز پر سر انقیاد خم کر دیں جنکے تیر بہدف علاج نے عرب کی اس جاہلیت زدہ قوم کو زندہ کر دیا تھا۔ جو جہالت و افلاس نفاق و شقاق اور غلامی نفوس کے انتہائی سے انتہائی درجہ میں پھنس رہی تھی نہ وہ خدا ہی کی رہی تھی نہ مخلوق ہی کی نہ اس نے ایمان ہی باقی رکھا تھا نہ شائستہ عمل ہی۔

جو اپنی بد اخلاقیوں اور بد عہدیوں کی بدولت اپنوں کو غیر اور غیروں کو دشمن بنا چکی تھی۔ جو انتہائی جہالت و سفاہت۔ نفاق و شقاق بدکاری و بد وضعی کی سبب اپنی علمی و عملی۔ مادی و روحانی اور منزلی و ملی زندگی تباہ کر چکی اور انسانوں کی صفوں سے نکلکر ڈھوروں کے گلہ میں جا ملی تھی۔ اس وقت اسی مقدس طبیب نے اپنے پر تاثیر معالجوں سے اس ڈوبتی ہوئی قوم کا جہاز طوفان ہلاکت سے نکالکر ساحل مراد پر پہنچایا اور اسکی مرض سلی کشا قبون کا تنقیہ کر کے اسے صحت و قوۃ کی سطح پر لا کھڑا کیا۔

حاذقش گو کو حکیم حاذق است
در علاجش سحر مطلق را ببین

صادقش داں گو امین و صادق است
در مزاجش قدرۃ حق را ببین

تجویز علاج

حضورؐ کے اس روحانی معالجہ میں تم اسپر غور کرو کہ آپ نے مبعوث ہوتے ہی جب ان بیمار انسانوں سے معالجانہ خطاب فرمایا تو نہ تو یہ کہا کہ لوگو تم افلاس کیوجہ سے تباہی کے کنارے آ گئے ۔ اسلئے تم دولت جمع کرو نہ آپ نے تشریف لاتے ہی فراہمیٔ دولت کیلئے سودی لین دین کے بینک قائم فرمائے ۔ نہ چند کالجوں اور اسکولوں کا سنگ بنیاد نصب فرمایا ۔ نہ پوسٹر اور اشتہارات دنیا میں شائع کر کے افواہی پروپیگنڈے کی بنیاد ڈالی ، بلکہ ان تمام امراض کا ایک نہایت ہی مختصر اور دلپذیر علاج یہ بتلایا کہ لوگو تم سب کے سب مریض ہو اور میں تم سے اور تمہارے سب اگلوں اور پچھلوں سے زیادہ تندرست صحیح المزاج ۔ معتدل الاخلاق ، مستقیم الاعمال اور ایک پاک روحانیت سے بھرپور انسان ہوں پس تم میں سے جسے اپنی صحۃ و استقامۃ منظور ہے وہ مجھ جیسا ہونے کی سعی شروع کر دے ۔ میرے قول جیسا قول میرے عمل جیسا عمل میری عبادۃ جیسی عبادۃ اور میری عادت جیسی عادت بنا کر گویا اپنی زندگی کو میری زندگی پر ڈھالنے کی کوشش کرے ۔ پس جو بھی ظاہر و باطن میں جسقدر میرے مشابہ ہوتا جائیگا اتنی ہی اسکی ظاہر و باطن کی صحۃ ترقی کرتی جائیگی ۔ کیونکہ میں عالم کے لئے ہر قسم کی روحانی تندرستیوں ، جسمانی پاکبازیوں اور قلبی دانائیوں کا اسوۂ حسنہ اور خدا کے اخلاق و کمالات کا مجسم نمونہ بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔ میرے نقش قدم پر چلنا ہی تمام امراض کا قرار واقعی استیصال ہے ۔

آپ نے ان مریضوں کو یہی بتلایا کہ میں تمہارے لئے ایک تیر بہدف نسخہ (قرآن) لایا ہوں ، جو شفاء لما فی الصدور ہے ۔ لیکن اس کی ترکیب استعمال صرف میرے ہی قول و عمل سے معلوم ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ قرآن میں جو چیزیں علوم و معارف ہیں وہ ہی چیزیں میری ذات میں آ کر اخلاق و اعمال ہیں ۔ جو بلند پایہ انسانیت کے احوال و کیفیات قرآن کی بلیغ معنویت میں مستور ہیں وہ میری روح پر وارد ہو کر واقعات و مشاہدات ہیں ۔ گویا خدا کا ایک قرآن علمی ہے جسکو میں وحی سے بولتا ہوں اور ایک قرآن عملی ہے اور وہ خود میں ہوں ۔ پس میں قرآن کی مجسم تفسیر اور اسکا عملی حل ہوں ۔ یعنی میں اور کتاب اللہ دو نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں ۔ کتاب الٰہی میں علوم کے رسوم و دوال ہیں اور مجھ میں ان علوم کے مناشی و اعمال ۔ اسلئے میرا کہا ہوا قرآن کا علم کی

اور میرا کیا ہوا قرآن کا عمل وکان خلقه القرآن[۱] پس میں قرآنی علوم کا نمونہ عمل اور اسوۂ حسنہ دکھلانے کیلئے بھیجا گیا ہوں تاکہ مریض دنیا میرے عمل کو دیکھکر قرآنی نسخوں کا استعمال سیکھ جائے۔

بہرحال قرآن جسطرح ایک جامع علوم کتاب تھی اسیطرح اسکے علوم کیلئے آپ کی ذات اقدس ایک جامع اعمال ذات تھی۔ چنانچہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے پاک اور مطلوب صورت آپ نے عملاً قائم کرکے نہ دکھلا دی ہو۔ صورت وسیرت۔ عادۃ وعبادۃ۔ آداب واخلاق۔ تہذیب ومعاشرت حب وبغض۔ دوستی ودشمنی۔ سفر وحضر۔ رزم وبزم۔ کہانا اور پینا۔ سونا اور جاگنا۔ اور خلاصہ یہ کہ موت وحیات کے تمام اچھے اور معقول نمونے جو قرآنی اور علمی شکلوں میں سربستہ تھے آپنے اپنے عمل سے ان کی صورتیں قائم فرما دیں اور ہر ہر شعبہ زندگی کے متعلق بتلایا کہ اسکی یہ صورت اچھی ہے اور یہ بری۔ یہ نقشہ عمل بھداہے اور یہ خوشنما۔ یہ حسین ہے اور یہ قبیح۔ غرض آپ نے ..... ان جاہلیت زدہ مریضوں کا واحد علاج یہی بتلایا... کہ وہ اپنی زندگی کو آپ کی حیاۃ طیبہ پر منطبق کریں کہ آپ ہی کی زندگی کمالات الٰہی کا نمونہ ہونے کیوجہ سے تمام عالم کی زندگیوں کے صلاح وفساد اور صحت وسقم کا ایک حقیقی معیار ہے۔ قرآن نے بیانگ دُھل اس دعوی کی تصدیق کی اور اعلان کردیا کہ۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر	تم لوگوں کیلئے یعنی ایسے شخص کیلئے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ

کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

پس جونہی کہ عرب کے وحشیوں نے اپنے علم وعمل کا رُخ اس قبلۂ علم وعمل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیرا یعنی اپنے اعتقادات واعمال اور دینیات وافعال کو آپ کے نقشۂ عمل پر منطبق کیا۔ اور اس اسوۂ الٰہی اور نمونہ اخلاق ربانی پر پورے اُترے فوراً ہی دو دنیا کے علماء سے عالم تر اقویا سے قوی تر مہذبوں سے فائق اور متمدنوں کے استاد بن گئے۔ الٰہیات میں وہ رشک حکماء کہلائے علوم ذات وصفات میں عرفاء مانے گئے علم طبیعیات وعقلیات میں رشک ارسطو وافلاطون تسلیم

[۱] آپ کا خلق بس قرآن ہی تھا۔ یہ مقولہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ جبکہ انسے اخلاق نبوی کے متعلق سوال کیا گیا تھا۔

کئے گئے۔ علم و اخلاق و عبادات علم معاش و معاد علم معاملات و سیاسیات میں غبطۂ ارباب دانش بنا دیے گئے۔ ان کی بدولت ریگستان عرب کی تہذیب نے مشرق و مغرب کی شائستگی کو ماند کر دیا یہودی و عیسائی، ہندی و چینی اور تمام مذاہب کی نا تمام تہذیبیں خجل ہو کر تشنہ دل، تجانوں، کلیسوں اور رہبانیت کے تنگ و تاریک زاویوں میں جا چھپیں۔ دنیا کے کتب خانے ٹٹولو اور تصانیف کے دفتروں کو کنگھالو تو نظر آئیگا کہ جہاں بھی شائستگی کا کوئی ذرہ چمک رہا ہے وہ عربی ہی علوم کے اشعہ کی کوئی ہلکی سی تابش ہے۔ اور پھر معلوم ہوگا کہ یا دنیا اُن کے نام سے باک رہی ہے اور یا ان کی ریزہ چینی پر مجبور ہے۔ اور جبکہ انہوں نے اپنے اخلاق کو اس خدائی نمونہ کے اخلاق پر منطبق کیا تو ان کے مکارم اخلاق، شجاعت و سخاوت۔ مروت و راستبازی۔ حلم و عفو۔ صداقت و دیانت۔ قناعت و توکل اور ایفاء عہد وغیرہ اس درجہ پر پہونچے کہ دنیا کے گردن کشوں کو انہوں نے مسخر کر لیا۔ وہ ایسے محبوب خلائق بنے کہ دنیا ان کے پسینے کو اپنے خون سے تولنے لگی۔ ان کے اخلاقی و تمدنی اور اقتصادی کارنامے عالم کے آفاق پر اس طرح چھا گئے کہ عالم کی تسلیم و رضا اُن کے قدموں میں آپڑی۔

بہرحال اسوۂ حسنہ کی عملی پیروی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ دور جو ان مربیان عالم کی بدولت دورِ جاہلیت کہا جاتا تھا اب صحابہ کی اس متقی اور معدول زندگی کی بدولت اس کا نام خیر القرون ہوا اور وہ دین و روحانیت اور وہ عام صداقت آمیز عزائم و اعمال کے لحاظ سے دنیا کا زرّیں عہد اور تمام قرنوں سے فائق و برتر زمانہ بن گیا۔ وہی تپ کہنہ کے مریض جن سے ہلنا جلنا اور کروٹ بدلنا دشوار تھا ایسے بھلے چنگے بنے کہ انہوں نے اپنی ایک جنبش سے کرۂ دنیا کو ہلا دیا اور عالم ہی کو کروٹ دیدی۔

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

اگر چشم فراست سے دیکھیے تو عربی قوم کے زبردست انقلاب کا حاصل تمہیں یہ نظر آئیگا کہ ایک حال سے اُن کو ہٹایا گیا اور ایک حال کی طرف انکو پہونچایا گیا۔ اور یقیناً جس حال سے اُن کو ہٹایا گیا وہی

جن کا مرض تھا ورنہ اس سے ہٹانے کی ضرورت نہ تھی اور جس حال کی طرف ان کو لایا گیا وہی حال ان کی شفا تھا ورنہ اسکی طرف لانے کی ضرورت نہ تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ حالت جو ان سے سلب کی گئی اصولی طور پر ان کا تشتت افکار و اعتقادات قلب و قالب کی آزادی اور کسی ایک اسوۂ ربانی کا پابند نہ ہونا تھا، اور وہ حالت جو ان میں پیدا کی گئی وہ ان کا وہ تقید تھا جو اسوۂ الٰہی کے ساتھ صورتاً و سیرتاً انہوں نے قائم کر لیا اور تمام ماسوائے کے رشتے توڑ کر ایک اسوۂ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہو گئے پس جاہلیت کے اس مہلک مرض اور اسکے کامیاب علاج کو سامنے رکھکر باسانی یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ بسیط ارض پر کسی نمونہ ربانی کا علماً و عملاً پابند ہو جانا ہی سب سے بڑی روحانی صحت ہے اور اس سے انحراف کر کے بے قید زندگی بسر کرنا یا صرف اپنے من گھڑت اسوہ ہائے خیال و عمل کا پابند ہو جانا ہی سب سے بڑا روحانی مرض ہے۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

اس نتیجہ کو پیش نظر رکھکر اب ہمارے لئے یہ باور کرا دینا کچھ دشوار نہ رہا کہ آج ہمارے امراض کے حقیقی اسباب نہ افلاس و غلامی ہے نہ جدل و خلافت اور جہالت و لاعلمی بلکہ ان تمام اسباب مہلکہ کا حقیقی سبب اور صرف ایک سبب یہی ہے کہ ہم میں پیروی نبوۃ کا داعیہ اور انقیاد رسالت کا جذبہ صادقہ نہ رہا۔ ہماری صورتوں اور سیرتوں نے بجائے اتباع کے ابتداع کی راہ اختیار کر لی بجائے تقید مسلک کے آزادی رائے نے ہمارے قلب و دماغ پر قبضہ کر لیا اور پھر نہ صرف ذوق اتباع فنا ہی ہو گیا بلکہ ہم اسکے دائرہ تصور سے بھی نکل گئے۔ اور اسی لئے اسلام کے ابتدائی قرون کے برعکس آج ہم کو بیکسی و بے بسی بے وقعتی و بے وزنی شکستہ بالی و بدحالی نے ہر چہار طرف سے آگھیرا۔ پس جبکہ ہم قرون اولیٰ کی مثالیں نہ رہیں تو ان کے مبارک آثار بھی ہم سے محو ہو گئے۔ اگر زندہ دلی کی ان ہی جیسی یادگاریں آج بھی ہوتیں اور انہی جیسی حقیقت و ہیئت، ان ہی جیسی صورت و سیرت اور شئون نبوۃ کے ساتھ ان ہی جیسی شیفتگی اس دور ابتلا میں بھی پائی۔ تو وہ تمام نتائج و ثمرات بھی قدرۃً رونما ہو جاتے جو ان سے کبھی ظہور پذیر ہوئے تھے۔ لیکن آج جبکہ وہ مثالیں مفقود ہیں

تو وہ زریں کارنامے اور سطوت و شوکت کے سنہرے آثار بھی دوبارہ عدم میں جنکی توقع ایسی مثالوں سے باندھی جاسکتی۔ اگر پھر وہی چیز ہم مجتوں کی طرف لوٹا دی جائے جو کبھی ان سعید انسانوں میں پیدا کردی گئی تھی تو بلاشبہ ہماری وہی ترقیات پھر دوبارہ لوٹ سکتی ہیں جنہوں نے ایک دفعہ ساری دنیا میں سنسنی پیدا کردی تھی اور عالم کو لرزا دیا تھا۔ اسلئے نتیجۃً کہنا پڑتا ہے کہ اسلامی قوم کا تمام تر عروج درحقیقت ان جیسا ہونے اور ان کی ظاہری و باطنی مشابہت پیدا کرنے میں پنہاں ہے۔ اور جبکہ اسی نسبت و پیروی اسوۂ حسنہ کی بدولت قرن اول کی صلاح و فلاح اور عالمگیر سرداری دنیا پر قائم ہوئی تو پھر ضرور ہے کہ اسی اتباع و پیروی کی بدولت آج بھی دنیا صلاح و فلاح کا چہرہ دیکھ سکتی ہے۔ اور یہ کچھ دور نہیں کہ امت پر پھر وہی دور جاہلیت عود کر آئے جس کا اس اتباع رسالت کے دور سے پہلے دور دورہ تھا۔ والعیاذ باللہ۔ امام مالک نے کیا خوب فرمایا ہے:

لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔

اس امت کا آخری حصہ بھی اسی چیز سے صلاح پا سکتا ہے جس چیز سے اسکے اول حصہ نے اصلاح پائی۔

پس ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے حسن و قبح یا شوکت و پستی کا واحد معیار ایک ہی نبوۃ کا اسوۂ حسنہ ہے کل بنا اور تمام کھلے اور چھپے ہمارے امراض کا واحد اور موثر علاج اگر ہے تو صرف یہی کہ ہم بجائے آگے بڑھنے کے پورے دو صدی پیچھے ہٹ کر اس اتباع اسوہ کا ربقہ اپنے گلے میں ڈال لیں اور ابتداع کو چھوڑ کر اتباع اختیار کریں۔

قرآن کریم نے اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی کا فرمان ان پرشوکت الفاظ میں صادر فرمایا کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر۔

تم لوگوں کیلئے یعنی ایسے شخص کیلئے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

دوسری جگہ حکم دیا کہ رسول کے لائے ہوئے علمی و عملی نمونوں کو قبول کرو۔

ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔

رسول تم کو جو کچھ دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیں رک جایا کرو۔

پھر خود صاحب اسوہ (جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے) اپنے ایک خطبہ میں فرمایا۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد وشر الامور محدثاتہا وکل بدعۃ ضلالۃ۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین خصلت و عمل، خصلت محمدی ہے اور بدترین امور نئی نئی بدعتیں ہیں۔ اور ہر ایک بدعت گمراہی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

من حفظ سنتی اکرمہ اللہ تعالیٰ باربع خصال المحبۃ فی قلوب البررۃ والھیبۃ فی قلوب الفجرۃ والسعۃ فی الرزق۔ والثقۃ فی الدین

جس نے میری سنت کا تحفظ کیا خدا تعالیٰ چار باتوں سے اسکی تکریم فرمائیگے۔ پاکبازوں کے دل میں اسکی محبت ڈالدیں گے اور بدکاروں کے دلوں میں ہیبت۔ رزق کو فراخ کردینگے اور دین میں پختگی نصیب فرادینگے۔

امام زہری نے فرمایا۔

الاعتصام بالسنۃ نجاۃ۔

سنت کا دامن تھامنا نجات ہے۔

امام مالک نے فرمایا۔

ان السنۃ مثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا ومن تخلف عنہا غرق۔

سنت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اسمیں سوار ہوگیا بچ گیا اور جو اسمیں نہ گیا غرق ہوا۔

پھر اس اتباع اسوہ سے انحراف کرنے پر قرآن نے دنیا کے فتنوں اور آخرۃ کے عذاب الیم کو ڈرایا اور

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبہم فتنۃ او یصیبہم عذاب الیم۔

سو جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آفت آن پڑے یا ان پر کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے۔

کہیں شقاق رسول اور عامۂ مسلمین کی راہ سے الگ ہو جانے پر جہنم کی دھمکی دی۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا۔

جو شخص رسول کی مخالفت کریگا بعد اسکے کہ اسکو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا رستہ چھوڑکر دوسرے رستہ ہو لیا تو ہم اسکو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اسکو جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی

کہیں دھمکایا کہ تحکمات نبویہ سے دل تنگ ہونے پر ایمان ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

پھر قسم ہے آپکے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جبتک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرادیں پھر اس آپکے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔

اور کہیں فیصلہ سنایا کہ کسی کام میں حکم خدا و رسول آجانے کے بعد کسی کا اپنا اختیار اس کام میں باقی نہیں رہ سکتا۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لہم الخیرۃ من امرہم۔

اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ انکو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے۔

اور آخر میں قرآن کے مصدق اول حضرت صادق مصدوق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی یہ بلیغ اور جامع شرح فرمادی کہ۔

لا یؤمن احدکم حتی یکون ہواہ تبعا لما جئت بہ

تم میں کوئی بھی اسوقت تک ایماندار نہیں ہو سکتا جبتک کہ اسکی خواہشات میری دعوت اور کام کے تابع نہ ہوجائیں۔

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آنجا جز آنکہ جان بسپارند چارہ نیست

پس جبکہ اسلامی زندگی کے تمام پہلوؤں کی صحت وسقم کا معیار صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ٹھہر گئی تو اب تم تہذیب وتمدن کا اچھے سے اچھا نمونہ لے آؤ عبادات وریاضت و نفس کشی کی سخت سے سخت مثالیں پیش کرو اور اخلاق ومعاشرت کی بے حد خوش آئند صورتیں دکھاؤ لیکن اگر وہ اس ربانی نمونہ پر منطبق نہوں ۔۔ جو تمہارے لئے بھیجا گیا اور ٹھیک اسی اسوہ کے مشابہ نہوں جو کامل بناکر اتارا گیا تو ناممکن ہے کہ وہ قبولیت کا شرف پاسکیں یا بارگاہ الہی تک پہنچ سکیں۔

بہرحال تقرب ومعرفت الہی اور طمانیت و انوار اور احوال وکیفیات میں وہی دستیاب ہوسکتی ہے۔

جن کو آپ اپنی ذات اقدس میں لیکر تشریف فرمائے عالم ہوئے۔ اور اس کے سوا ہر راہ خطرناک

ہو در ہر طریق ہلاکت انگیز ہے۔

آنکس کہ شد متابع امر تو رست بجا	وانکو خلاف رائے تو ورزید شد ہلاک

اسی اتباع سنت نبوی کا نام اتباع سنت یا تشبہ بالانبیاء ہے۔ اور اس اتباع سے منحرف ہو کر دوسری ملل و اقوام کی پیروی کرنے کا نام تشبہ بالاغیار ہے جس پر بحث کرنے کیلئے ہمیں اسوقت قلم اٹھانے کی توفیق ہو رہی ہے اور ہمیں اس خوش قسمتی پر انتہائی مسرت ہے کہ ہم نے اسلام کے ایک ایسے اصولی مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے جو مسلم افراد اور مسلم قوم کی مقبولیت و نامقبولیت کا واحد معیار اور رضاء و نارضاء الٰہی کا تنہا مدار ہے اور جس کی ہمہ گیری سے اسلامی تعلیم کا کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں ہے۔

ہم نے بحث تشبہ کی اس پہلی جلد کو جو اس وقت پیش ناظرین ہے، دو بابوں پر منقسم کیا ہے پہلے باب میں ہم محققانہ طریق پر متعدد فصلوں کے ذریعہ مسئلہ تشبہ کا ماخذ و منشا اور اسکی عقلی و شرعی حقیقت وغیرہ بے نقاب کریں گے۔ اور دوسرے باب میں مناظرانہ طرز پر ان تمام شبہات کا استیصال کرینگے جو متفرنجوں یا سادہ لوحوں کیطرف سے اس مسئلہ میں پیدا کئے گئے۔ اور آخر میں ایک تتمہ کے ذریعہ ایسے آثار و مضامین پیش کریں گے جنہیں ناصحانہ طور پر تشبہ بالکفار سے انذار کیا گیا ہے۔ اور اس پہلی جلد کے بعد جس میں محض اصولی حیثیت سے مسئلہ پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ بقیہ دوسری جلد میں انشاءاللہ تشبہ کی فروعات اور جزوی مسائل کا ذخیرہ پیش کیا جائیگا۔ وباللہ التوفیق وبیدہ ازمۃ التحقیق

بابُ اوّل

فصل

مسئلۂ تشبّہ کا منشا اور ماخذ

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اسلام ایک نہایت ہی کامل و مکمل، جامع و مانع، اور ناقابلِ تبدیل دستور العمل کا عنوان ہے۔ زندگانی کے وہ تمام شعبے جنکا جامعیت کیساتھ دنیا کی کوئی ملت احاطہ نہ کر سکی تھی، اسلام کے وسیع دائرہ نے ان سب کو اپنے اندر انتہائی کمال و تمام کے ساتھ لے لیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

تمام بود بیک حرفِ گرم و ما غافل	حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

اس نے اپنی کوئی اصل و فرع ایسی تشنہ اور ادھوری نہیں چھوڑی کہ ایک جویائے حق کے لئے کسی کھٹک یا حیرانی کا باعث بنے۔ گویا اس نے انتہائی جامعیت کے ساتھ سارے ہی کمالات و منافع اور دنیوی و اخروی بہبود کے اصول اپنے لئے مخصوص کر دئیے اور تمام دوسروں کے لئے سوائے نقصان و مضرت، اور قلت جدوی کے کچھ نہیں چھوڑا اور اسی لئے جہاں تک معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے عموماً اقوام عالم کی مذہبی سوسائٹیاں اس مرکز کمال کیطرف سمٹی چلی آ رہی ہیں۔

چنانچہ آج مغرب میں تو یورپ کے دانشمند اسکے صداقت کے اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں اور مشرق میں ہندوا ور آرین قومیں کھلی بت پرستی سے تنگ آکر اسلام کے دامن توحید میں پناہ لینے کے لئے جھک رہی ہیں۔ پس جبکہ اس کے حسن کمال اور نفع لازوال نے غیروں کو بھی صرف اپنی ہی خوشہ چینی پر مجبور کر دیا ہی تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنوں کو کسی آن بھی دوسروں کے ناقص خرمنوں سے ریزہ چینی کی صلاح دے؟ یا اس خوردہ چینی سے باز رکھنے کی سعی نہ کرے؟ ہرگز نہیں کیونکہ اسلام آنیکے بعد غیر مسلم اقوام کے تمام اصول علم و عمل دنیا کی روحانیت کے لئے یا مضر ثابت ہونگے یا ناقص۔ اور اس مضرت و نقصان کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ان منسوخ شدہ ملتوں کے تمام احکام (خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی۔ تمدنی ہوں یا اقتصادی)

تین قسم پر منقسم ہیں۔

(۱) ایک وہ احکام ہیں جنکو صراحۃً اسلام نے منسوخ کر دیا کہ وہ دنیا کی روحانی مزاج کے موافق نہیں رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اسلام آجانے کے بعد ایسے احکام کو دستور العمل بنا لینا یقیناً قسم قسم کی جسمانی و روحانی مضرتوں کا استقبال کرنا ہے اگر فی الحقیقت ان احکام کے نسخے دنیا کی مریض ہستیوں کیلئے اسی طرح شفا بخش اور موافق مزاج رہتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسلام ان کو منسوخ کر کے نئے نسخے پیش کرتا

(۲) دوسری قسم کے احکام وہ بدعات و محدثات ہیں جنکو یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان یا دوسری ملتوں کے رہنماؤں کے جذبۂ تعبد اور دماغی تعمق نے ملتوں میں اضافہ کیا۔ اور بعض اپنی خود ساختگی سے سلاسل و اغلال امتوں کے گلے میں ڈال دئے۔ ظاہر ہے کہ مضرت رسانی میں یہ خود ساختہ بدعات منسوخ اعمال سے بھی زیادہ بلند پایہ ہیں۔

(۳) تیسرے وہ امور ہیں جو اگرچہ صراحۃً منسوخ نہیں ہوئے لیکن جبکہ انکی مجموعی ملت ترمیم و تنسیخ یا زیادہ و نقصان کی قابلیت رکھتی تھی (اور اسی لئے منسوخ بھی ہوئی) تو یہ امور بھی زیادتی و کمی کو قبول کر سکتے ہیں۔ اور کسی چیز کا زیادۃ و نقصان کے قابل ہونا اسکے غیر مکمل اور ناقص ہونیکی دلیل ہے ظاہر ہے کہ ایسی ناقص اشیا کو اپنے لئے نظام عمل بنانا سرتاسر اپنے آپ کو ناقص، ادھورا۔ اور غیر مکمل چھوڑنا ہے۔

پس جبکہ اسلام نے ان ناقص و مضر اور ادھوری اشیا کے مقابلہ میں بہت زیادہ منفعت بخش مکمل اور غیر قابل ترمیم و تنسیخ اشیا پیش کیں تو صرف اسی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ امت مرحومہ کو مردہ اقوام کی موت زدہ اشیا اور ناقص و مضر اعمال سے بچانے پر زور دے۔ اور اپنے پیروں کو اتنا خود دار بنا سکھلائے کہ وہ اپنی مکمل متاع کے ہوتے ہوئے دوسروں کی ناقص پونجیوں پر نگاہ حرص نہ ڈال سکیں

پس شریعت اسلام نے اپنے اسی واجبی حق یعنی اپنے نفع و کمال اور منسوخ ملتوں کے نقصان و ضرر کو دیکھتے ہوئے منع تشبہ کا اصول قائم کیا تاکہ امت کو غیروں کی مضرت کے ظاہری و باطنی تشابہ یا بالفاظ دیگر حق و باطل کے اختلاط اور نفع و ضرر کی آمیزش سے باز رکھا جا سکے۔

ورنہ اسلام جیسی جامع اور لاتبدیل ملت کا مسئلہ تشبہ میں تساہل کر جانا یا اصولاً اس کو جائز رکھنا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ کمال کو نقصان سے بدلنے اور مضار کو منافع کے بدلہ خرید لینے کے لئے تیار ہے۔ اور یہ خود اس کی جامعیت پر عیب لگانا ہے نعوذ باللہ منہ۔

پس اگر سچ مچ کوئی قانون تشبہ بالغیر سے روکنے کا حق رکھتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی کا مکمل قانون ہے اور گویا تشبہ کا اصول صرف اسلام ہی کے لئے آسمان سے آرہا تھا۔

پس اسلام کا منع تشبہ پر زور دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مکمل طبیب یا ڈاکٹر ہی تمام ماکولات کے نفع وضرر کی تفصیل کر دینے کے بعد ہر چیز کی مخلوط خیر وشر میں سے تحصیل منفعت کی ترغیب دے اور اجتناب مضرت پر اپنا پورا زور صرف کر دے۔ اسی طرح جبکہ شریعت نے اپنی تفصیلی تعلیمات میں واضح کر دیا کہ ہر چیز کے خیر کا پہلو تو ملت اسلامی کے لئے ہے۔ اور مضرت یا نقصان منفعت کے سارے پہلو دوسری قوموں کیلئے تو اب اس کا یہ اصرار بجا ہوگا کہ اس کے حلقہ بگوش ہر ہر جزئی میں اسی کے متبع بنکر منافع سے مستفید ہوں اور غیروں کی مشابہت سے بالکلیہ یکسو ہوکر مضرتوں سے بچیں۔

پس تشبہ سے بچائے جانیکا حاصل یہ ہوگا کہ شریعت اسلام انسانی جذبات کو پامال کرنے کے بجائے صرف یہ چاہتی ہے کہ ان کا استعمال تو کیا جائے مگر شر سے الگ کر کے صرف خیر میں۔ اور مضرت سے بچاکر صرف منفعت میں۔ اور یہ اسلئے کہ خیر وشر اور نفع وضرر دو متضاد کیفیتیں ہیں جو کبھی جمع نہیں ہوسکتیں۔ بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے عدم کا مقتضی ہے۔ اگر بنی آدم کی بھوکی روح کو جو نہایت بیتابی کے ساتھ غذاؤں کی جویاں ہے مضر اور بدترین غذاؤں کی کثرت بڑھ بڑھ کر دیا جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ نافع اور پاکیزہ غذاؤں سے محروم رہ جائیگی۔ اگر اس نے اپنی طبیعت بھری ہے اور ساری پر مبتذلات ومنسوخات کی کثیف غذا استعمال کرلی تو ضرور ہے کہ وہ مقتضی انبیا کی ستھری اور لطیف غذاؤں سے نفرت کرے بلکہ نفور بھی ہو جائے کیونکہ شکم سیری کے بعد ہر غذا اگرچہ وہ کتنی ہی لطیف ہو مرغوب نہیں رہتی۔ اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ما ابتدع قوم بدعۃ الا نزع اللہ عنہم	کبھی کسی قوم نے کوئی بدعت ایجاد نہیں کی کہ خدا نے ایک

حتیٰ السنۃ ۃ   ویسی ہی سنت سے اسے محروم کر دیا ہو۔

چنانچہ یہ حقیقت بار بار مشاہدہ میں آتی رہتی ہو کہ جو شخص طبعًا زنا یا فواحش و منکرات کیطرف مائل ہے وہ نکاح اور حلال زوجات سے ہمیشہ نفور رہتا ہو۔ کیونکہ اسکے مادی جذبات کے استعمال کا ایک ناپاک راستہ متعین ہوچکا ہو اسلئے وہ دوسرے راستہ سے بیزار ہو۔

جو لوگ من گھڑت افسانوں، ناولوں اور قصص ملوک و سلاطین کے دلدادہ ہیں کم دیکھا گیا ہو کہ وہ سیر انبیاء اور آثار علماء و صلحاء سے بھی ویسی دلچسپی رکھتے ہوں۔ کیونکہ ان کا جذبۂ تاریخ پسندی جبکہ ایک طریق میں غلو کے ساتھ استعمال ہوا تو دوسرے سے توجہ ہٹ گئی۔

جو لوگ مشاہد و مقابر اور آثار اولیاء کی حاضری کو فریضۂ تعبدی کہنے میں غلو رکھتے ہیں عمومًا وہ اللہ کے بیت حرام اور مشاعر حج کی حاضری کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کیونکہ ان کا یہ جذبۂ صالحہ جبکہ ایک راستہ سے گذرنے لگا تو لامحالہ دوسرا راستہ خود ہی چھوٹ گیا۔

عمومًا دیکھا گیا ہو کہ جن لوگوں کی عملی زندگی کے لئے اہل اللہ کے شخصی حالات ان کے عشق کی وارفتگیاں اور بیخودانہ شطحیات ہی سب سے بڑی حجت و برہان کا درجہ رکھتے ہیں وہ بیشتر وہی ہیں کہ کتاب اللہ کی غامض حکمتیں اور حدیث نبوی کا علمی و عملی ذخیرہ ان کے استدلال کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ جاذب توجہ بھی نہیں ہو۔

سینکڑوں وہ لوگ جو ارسطو اور ابن سینا کے دماغی اختراعات کے آب نا سرد ہی سے اپنی علمی پیاس بجھا لینا انتہائی کامیابی جانتے ہیں کم دیکھا گیا ہو کہ وہ اسی بے تاب ذوق و شوق کو لیکر خدا کی آیات اور اسکی سیجز منطق کے بحر بے پایاں پر بھی سیراب ہونے کیلئے گذرتے ہوں۔

ان تمام نظائر سے یہ نتیجہ مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ انسان کے تمام مادی اور روحانی جذبات ایسے بالکلیہ خیر و شر۔ نفع و ضرر۔ نیک و بد کے دو متضاد پہلو رکھتے ہیں۔ اور کسی ایک کی طرف جھک جانا یقینًا دوسرے سے مستغنی بنا دیتا ہے۔ پس شریعت کے لئے یہ کسی طرح قابل الزام نہیں کہ وہ تشبہ بالغیر کی ممانعت کے ذریعہ تمام سبل متفرقہ کے مضر پہلوؤں اور ملل ناقصہ کے ناقص جذبات

سے بچا کر انسان کو صراطِ مستقیم اور ایک نہایت ہی سیدھی اور سچی راہ پر لگا دینے کی خواہشمند ہے اور اپنی بے انتہا شفقت سے چاہتی ہے کہ سارے روحانی دسترخوان لپیٹ کر صرف خدا کا وہ وسیع دسترخوان بچھائے جس پر چنی ہوئی غذائیں ہر قسم کی مضرۃ و منقصت سے پاک اور ہر طرح کی منفعت و جامعیت سے لبریز ہیں۔

ان کل آدب یحب ان تؤتیٰ مأدبتہٗ وان مأدبۃ اللّٰہ ھی القرآن (الحدیث)

ہر ایک داعی کے دعوتی کھانے کو قبول کرنا مرغوب ہے اور خدا کا دعوتی طعام یہ قرآن ہے۔

پھر شریعت نے اپنی بے انتہا شفقت سے اس وسیع دسترخوان پر نہ صرف دینی منافع ہی کی غذائیں لا کر چن دی ہیں، بلکہ دنیوی بہبود کی تمام الوانِ نعمت بھی قرینہ سے لا کر جمع کر دیے ہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک ایک مسلمان کی دنیا اس کے دین سے الگ ہو کر کوئی چیز نہیں۔ اور اس کی معاشرۃ کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس پر دین کی روشنی نہ پڑ رہی ہو۔ پس جس طرح منعِ تشبہ کا اصول تمام ابوابِ دین پر حاوی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اسی طرح ہماری دنیا کا بھی کوئی پہلو اس کے دائرہ سے باہر رہ سکے۔ بلکہ اگر نگاہِ غائر سے کام لو تو محسوس ہوگا کہ منعِ تشبہ کی ضرورت اگر دین میں ہو تو تمدن میں اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ غیر اقوام کا دین تو اپنی نمایاں کوتاہیوں کے سبب ایک مسلم کیلئے عموماً جاذبِ توجہ نہیں کہ وہ تشبہ کی طرف مائل ہو۔ لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ اس کی متشبہ نہ توجہ اسلام کی سادہ اور بے تکلف معاشرت سے جس کی اساس تقدس و تقویٰ پر رکھی گئی تھی ہٹ کر غیر اسلامی معاشرتوں کی نظر فریب رنگینیوں اور طفلانہ تنعمات کی طرف منعطف ہو جائے جنکی بنیاد محض تلذذ و تعیش اور ساختہ تمدن پر قائم ہے۔

	تکلفات وحشیانہ رنگینیت	

اور ظاہر ہے کہ حظوظِ دنیا کے یہی الوانِ لباس و تکلفاتِ سادہ اور تمام قلوب کو اپنے اندر منہمک کر کے اس اصل مقصد رجوع الی اللہ سے غافل کر دیتے ہیں جس کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی۔ اور پھر بینا عاقبت اندیش دل اس حقیقت تک نہیں پہونچنے کہ یہ تنعمات یہاں تو سرور و تزاحم

ہیں مگر عالم آخرۃ میں یہی چیزیں ہموم و آلام ہیں۔

وہ نہیں سمجھتے کہ یہی مادی تلذذات جو محض وسائل کا درجہ رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ان روحانی امور میں حائل اور سد راہ ہو جاتے ہیں۔ جنکو خدا نے تو مقاصد کا درجہ عطا فرمایا تھا۔ مگر ان غافل قلوب نے انھیں وسائل سے بھی گرا دیا۔

پھر ان نابینا قلوب کی آنکھیں اس بداہت کو بھی نہیں دیکھتیں کہ یہ خوشنما اور نگاہ فریب معاشرہ کتنی ہی راحت دہ اور خوش منظر کیوں نہ ہو لیکن بہرحال انہی قلوب کی ساختہ اور تراشیدہ ہے جن میں کفر وفسق اور غفلت کی گندگی بھری ہوئی ہے اور جب کہ قلب جو ساری اقلیم تن کا سلطان ہے کفر کی مہلک مرض میں دم توڑ رہا ہے تو ناممکن ہے کہ اس اصل کا فساد فروع پر نہ پھوٹ نکلے۔ اور جوارح پھر جوارح کے تمام افعال و اعمال اور تخیلات و افکار کا کوئی حصہ حسب حیثیت اس روحانی جانکنی سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے	کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

پس کفار کی ساری ہی خوشنما معاشرت سے (جو انجام کے اعتبار سے یقیناً مضرت انگیز اور نقصان رساں ثابت ہوتی ہے) بالکلیہ متارکت اور قطع مشابہت اس مسلم کے لئے ضروری ہے جس کو صرف پیشانی ہی کی آنکھ نہیں دی گئی بلکہ پیش آئی کی نگاہ دور بین بھی عطا ہوئی ہے اور جو کسی طرح ان اندھوں کی مانند نہیں جن کی انجام بینی کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں ہیں۔ کہ وہ عاجل میں پھنسکر آجل کی طرف آنکھ ہی نہیں اٹھا سکتے۔

إن هؤلاء يحبون العاجلة ويذرون وراءهم يوماً ثقيلاً۔	یہ لوگ (کفار) دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن چھوڑ بیٹھے ہیں۔

بہرحال امتوں کے اسی عملی و ضلال اور مرکز دین سے ہٹ جانے کو دیکھکر اسلام نے بطور پیشبندی جہاں منع تشبہ کے اصول سے عبادات میں کام لیا ہے وہیں معاملات و معاشرات میں بھی وہ اس تحفظ حدود سے غافل نہیں رہا اور اس نے دنیوی امور کے تمام گوشے منع تشبہ کی حدود میں لے لئے ہیں

جیسا کہ آئندہ واضح ہو جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

الحاصل (۱) منع تشبہ ہی ایک ایسا اصول ہے کہ جس کے ذریعہ شرائع اپنی حدود کو فنا اور التباس اور تباہ کن اختلاط سے بچا سکتی ہیں۔

(۲) اور تمام شرائع میں صرف شریعت اسلام ہی اس کی حقدار ہے کہ وہ اس اصول سے کام لے کیونکہ دوسری تمام ملتوں کے مقابلہ میں خیر محض۔ کمال محض۔ اور منفعت محضہ صرف اسی کی حدود میں سے جو پس بچائے جانے یا التباس سے محفوظ رکھے جانے کے قابل بھی صرف اسی کی حدود ہو سکتی تھیں

(۳) اور اب یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکل آیا جو اس فصل کا موضوع تھا، کہ منع تشبہ کا منشاء اور ماخذ شریعت اسلام کا کامل الذات محض ہونا اور دوسری ملتوں کا ناقص و مضر ہونا ہے۔ اگر معاذ اللہ اسلامی شریعت بھی ناقص ہوتی تو ضرور اس کی اجازت دی جا سکتی کہ جہاں بھی اوضاع کمال دستیاب ہو سکیں حاصل کی جائیں اور ان سے تشبہ و تخلق کیا جائے لیکن جبکہ ایسا نہیں تو پھر ایسی اجازت بھی کبھی نہیں دی جا سکتی۔

فماذا بعد الحق الا الضلال فانیٰ تصرفون۔	حق کے بعد رہا کیا بجز گمراہی کے پھر کہاں پھرے جاتے ہو۔
خلاف پیمبر کسے رہ گزید	کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

منع تشبہ کی اہمیت و ضرورت اور اس کا منشا و ماخذ دکھلا دینے کے بعد آئندہ فصل میں ہم اس کی اصلیت و حقیقت عقلی و حسی حیثیت سے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ تشبہ کیا چیز ہے اور اس کے آثار و لوازم کیا ہیں، پھر ہر شخص خود فیصلہ کر سکیگا کہ آیا اس کی اجازت دی جانی چاہئے یا اس سے باز رکھنے کی سعی کی جائے۔

فصل ۵

تشبہ کی حقیقت

عقلی اور حسی حیثیت سے

رموز اہل حقیقت بگویت نیفتی	اگر بطالب معنی خبیر توانی کرد

کائنات کی ہر چیز کی ایک مخصوص شکل ہے جس کے ذریعہ سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ جو چیز بھی پردۂ دنیا پر آتی ہے وہ اپنی شکل وصورت اور رنگ روپ ساتھ لاتی ہے تاکہ اسے اپنا وجود منوانے اور ممتاز ہوکر نمایاں ہونے میں کسی قسم کا التباس سد راہ نہ ہو۔ خدائے حکیم وقدیر کے بے پایاں حکمت اور فیاض قدرت نے ہر حقیقت کو اس کے مناسب پیرایہ اور ہر باطن کو اسکے شایاں شان ظاہر بخشا ہے پس دنیا کی ہر ایک مستور حقیقت جب ظہور کرتی ہے تو اپنی ہی شکل میں آتی ہے۔ اور کائنات کا ہر مکنون راز جب پردۂ انکشاف پر آتا ہے تو اس شکل میں جو اسکو بدو فطرۃ سے دیدی گئی ہے۔ حیوانات کی تمام نوعیں۔ انسان۔ شیر۔ گھوڑا۔ گدہا۔ وغیرہ پھر نباتات کی تمام قسمیں۔ درخت۔ گھانس۔ جڑی۔ بوٹی۔ بیل وغیرہ اسی طرح جمادات کی تمام جنسیں۔ اینٹ۔ پتھر۔ چونہ۔ ریت۔ مٹی وغیرہ سب ہی وہ اشیاء ہیں کہ فطرۃ اپنی اپنی صورتیں ساتھ لائی ہیں۔ اور انہیں صورتوں کی بدولت دنیا میں ان کا امتیازی وجود قائم ہے۔

باعشق لازم رنگ است دریں بازیگاہ	بیچ تدبیر جہاں نیست کہ بے رنگ شویم

اگر زید عمرو سے الگ دکھائی دیتا ہے یا ایک مکان دوسرے مکان سے علیحدہ نظر آتا ہے یا ایک کپڑا دوسرے کپڑے سے ممتاز معلوم ہوتا ہے تو وہ یقیناً اپنی خصوصیات ہیئتہ کے سبب جو ان میں مشترک نہیں بلکہ آپس میں جداگانہ اور ممتاز ہیں۔ یعنی ایک مکان کا جو مخصوص نقشہ ہم اپنے ذہن میں اتارتے ہیں وہ دوسرے کو میسر نہیں۔ اسلئے یہ مکان اس مکان سے الگ ہے یا کپڑوں کی شناخت

کے وقت ہم ان کے سوت کی رقت و غلظت کپڑے کا چکنا اور کرخت ہونا دیکھ کر ہی ایک کپڑے کو دوسرے سے امتیاز دیدیتے ہیں۔ اسی طرح جبکہ ہم زید کے چہرے اور قد و قامت کی وہ مخصوص صفات و اعراض دیکھتے ہیں جو عمرو کیلئے نہیں ہیں تو یہی زید کا امتیاز ہے جو اس کو عمرو سے الگ اور جدا ثابت کر دیتا ہے۔ ان اعیان کو چھوڑ کر اب اعراض میں آؤ تو یہی صورتوں کا اختلاف وہاں بھی چھایا ہوا ہے جس نے ہر ایک کو امتیاز اور خودی و ہستی کی دولت دے رکھی ہے۔ نور کی شکل اور ہے اور ظلمت کی اور۔ دن کی حقیقت جب ظہور کرتی ہے تو اپنی ہی نورانی شکل پر اور رات جب ظاہر ہوتی ہے تو اپنی ہی تاریک اور بھیانک شکل پر۔ الوان کو دیکھو تو سیاہ رنگ کی وہ شکل نہیں جو سرخ کی ہے اور سرخ کی وہ نہیں جو سبز و سیاہ کی ہے بلکہ ہر ایک اپنے صوری امتیازات کو لئے ہوئے ہی اپنے وجود کی نمائش کر رہا ہے۔

پھر نہ صرف کائنات کی جزئیات کا جزئیات بنکر رہنا ہی ان امتیازات کا رہین منت ہے۔ بلکہ عالم کی کلیات اور مجموعے بھی باہمی فصل و تمیز میں انہی مخصوص اشکال و اعراض کے دستنگر ہیں۔ ایک جنس دوسری جنس سے ایک نوع دوسری نوع سے اور ایک صنف دوسری صنف سے محض انہی خصائص کے بدولت اپنے مستقل وجود دکھائے ہوئے ہے۔

مثلاً جمادات کے نوعی دائرہ میں جب ہم پتھروں کی تلاش میں نکلتے ہیں تو کبھی پتھر کے دھوکے میں ریتہ اور لکڑی نہیں اٹھا لاتے کیونکہ پتھر کی اک قدرتی شکل متعین ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے اسی لئے نہ پتھر کو اینٹ کہہ سکتے ہیں نہ اینٹ کو پتھر۔ نباتات کو لو تو آم دیکھ کر ہمیں کبھی سیب و انار کا دھوکا نہیں لگتا کہ ان کی صورتیں ممتاز ہیں۔

حیوانات میں اگر ہم انسانیت کو پانا چاہیں تو اس کو کس شکل میں تلاش کریں؟ کیا گدھے گھوڑے اور شیر کی صورتوں میں یا اس کے دوسرے ابنائے جنس کی شکلوں میں؟ نہیں بلکہ انسانیت کو انسان ہی کی شکل میں پایا گیا ہے اور شیر کی مفترسانہ حقیقت کو اسی کی صورت میں۔ کیونکہ شیر کو جو نوعی حقیقت چیر پھاڑ وغیرہ اور جو نوعی صورت یعنی مخصوص الوان و اعراض بد نظرہ سے

دیے گئے ہیں وہ انسان کو نہیں ملے اس لئے شیر انسان نہیں۔ اور ادھر انسانی قوٰی ہیں ادراک و تصور کی وسیع طاقت۔ ایجاد و اختراع کی زبردست قوت۔ نفاست و نزاہت کی خوش آیند صفت لباس اور زینت آرائی کی خوش منظر حالت۔ کھانے اور پینے میں قسم قسم کی جدت پھر ظاہری قوٰی میں چہرے اور جسم کی وہ پاکیزہ صورت جو انسان کے حصے میں آئی ہے وہ شیر کو میسر نہیں اس لئے انسان شیر نہیں۔ بلکہ تمام ہی حیوانات سے الگ ایک ممتاز حیوان ہے۔ اگر اس کے ظاہر و باطن کو ان خصوصیات سے محروم کر دیا جائے تو یقیناً بلا شعور حیوانات کے وہ بھی ایک عجیب و غریب شکل و شمائل کا حیوان۔ اور یا صرف ایک ذی حرکت اور گول مول کرہ ہو جائے۔

پھر انسانی نوع کے افراد میں باوجود اتحاد نوعی کے ایک صنفی تقسیم جاری ہو جاتی ہے۔ جو انہی خصوصیات اور مخصوص آثار کا نتیجہ ہے۔ زن و مرد کی حقیقت ایک ہے۔ پھر ان کے حیوانی و نفسانی جذبات اور فطری اقتضاءات متحد ہیں۔ لیکن پھر بھی باہم ایک تفریق عظیم ہے۔ جس نے متحد الحقیقت نوع انسانی کو دو صنفوں پر تقسیم کر دیا۔ ان کے اسماء بدلے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت سے تعبیر کیا گیا۔ ان کے احکام بدلے ان کے حقوق متفاوت ہو گئے۔ یہ سب انہی صنفی امتیازات (جسامت و نزاکت۔ صغر و کبر۔ اوضاع و اطوار بدن۔ اعمال ظاہر و باطن۔ اخلاق و ملکات وغیرہ) کی تفریق و تخصیص کا اثر ہے۔ کہ دو صنفیں باوجود ایک داخلی اور معنوی اتحاد کے زیر اختلاف آ گئیں اگر یہ صنفی خصوصیات ان دو صنفوں میں سے نکال دی جائیں تو یقیناً امتیاز بھی اٹھ جائے اور زن و مرد کے ایک ہو جانے سے یہ زبردست صنفی اختلاف ہی نابود ہو جائے۔

غرض زمین سے لیکر آسمان تک حیوانات ہوں یا نباتات و جمادات اگرچہ ایک ہی مادے سے سب کا نشو و نما ہے اور ایک ہی خوان وجود سے ہر ایک کو حصہ ملا ہے۔ لیکن باوجود اس وحدۃ وجود اور توحید طینت کے خدا کی وسیع حکمت نے ان کی صورتوں میں اختلاف ڈال دیا تاکہ ایک سے دوسرا پہچانا جا سکے۔ ان میں امتیاز قائم رہے اور اس طرح ہر ایک سے جو منافع اور اغراض متعلق ہیں وہ پورے ہوتے رہیں اگر تلبیس کی رو سے ایک نوع کا کوئی فرد اپنی خصوصیات کو

چھوڑ کر دوسری نوع کے دائرہ خصوصیات میں داخل ہو جائے تو پھر ہم اسکو اس پہلی نوع کا فرد نہیں کہہ سکینگے بلکہ اس دوسری اختیار کردہ نوع کا۔ اگر بالفرض ایک گدھا کسی ذریعے انسانی شکل اختیار کرلے۔ اور بالکل انسانوں جیسا ایک انسان ہو جائے تو پھر کوئی بتلائے کہ کیا اسکو باوجود اس خوشنما چہرے اور قد وقامت کے بھی گدھا ہی کہینگے؟ کبھی نہیں بلکہ انسان! ورنہ اگر اس انسانی شکل میں بھی ایک گدھا گدھا ہی پکارا جائے تو پھر اس انسانی شکل میں انسان کو صرف انسان کہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

دیکھو ایک شعبدہ باز جب ایک رسی کو اپنے ٹوکرے میں بند کرکے اس پر اپنا ڈنڈا پھرائے اور تھوڑی دیر میں ٹوکری اٹھا کر رسی کے بجائے ایک جیتا پھرتا سانپ نکال دے تو کیا اس تبدیل ہیئت کے بعد بھی اسکو رسی ہی کہینگے؟ ہرگز نہیں۔ اسلئے کہ سانپ اور رسی کی شکلیں جدا جدا متعین ہیں جب کسی شکل میں کوئی حقیقت ظہور کرے گی تو اسی شکل کے اسماء اسی کے احکام اسپر جاری کردئیے جائیں گے اگر رسی نے ظاہر میں سانپ کا حلیہ لے لیا اور اس کے مشابہ ہوگئی ۔۔۔۔۔۔۔ تو وہ بلاشبہ سانپ ہی پکاری جائیگی نہ کہ رسی اور لوگ اسی طرح اس سے خوف کھا کر دوڑنے لگیں گے جس طرح سانپ سے بھاگتے ہیں۔

غرض کائنات کی ہر ہستی کو خدا کے جود وکرم نے ایک مخصوص و ممتاز شکل دیدی اور وہ اپنی مستور حقیقت کو اپنے نام سے اسی شکل میں نمایاں کرسکتی ہے۔ جس کا لباس فطرتی طور پر سے پہنا دیا گیا ہے۔

ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدی | ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ عطا فرمائی پھر راہ دکھائی

دنیا کتنی ہی اتحاد پسند اور یکسانیت کی تمنا ہو جائے لیکن کائنات کی ان مختلف شکلوں اور متفاوت صورتوں کے اتحاد و اختلاط کو کبھی گوارا نہیں کرسکتی۔ شاید ایک دیوانہ اور سڑی بھی اسے پسند نہ کرے کہ رات اور دن ایک شکل کے ہو جائیں۔ نور و ظلمت میں کوئی امتیاز نہ رہے۔ سارے عالم کی ایک ہی شکل ہو جائے۔ ایک ہی رنگ ہو۔ ایک ہی حجم ہو۔ اور سب سب بنوں بلکہ

وہ سب ایک ہی ہوں۔ گویا ان پر سب یا تمام کا اطلاق محض مجازی اور فرضی ہو جو انسان ہو وہی گدھا ہو اور جو گدھا ہو وہی شیر اور بکری بھی ہو۔ آم کے درخت کو ببول بھی کہا جائے اور ببول کو گلاب و یاسمن بھی پکارا جائے۔ جس کو ہم پتھر کہیں اسی کو اینٹ اور چونا بھی کہیں۔ کل ہی جزو بھی ہو اور پھر وہی کل بھی۔ سیاہ میں سفید نمایاں ہو اور سفید میں سیاہ۔ زمین ہی آسمان ہو اور آسمان ہی زمین ہو۔ رات دن ہو اور دن رات۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ نہ زمین رہے نہ آسمان۔ نہ دن رہے نہ رات۔ نہ سفید ہو نہ سیاہ اور نہ عالم میں جزئی جزئی ہو نہ کلی کلی۔ ظاہر ہے کہ جب ذرات عالم میں اس تکوینی میل میل اور خلط ملط کی وجہ سے ایسی وحدت آجائے کہ ایک اور یکتائی کے سوا دوسرے اور دوئی کا پتہ نہ ہو۔ گویا سب کچھ ہونے کے بعد کچھ بھی نہ ہو تو نہ عالم کو اپنے اجزاء کی ضرورت رہتی ہے نہ اجزاء کو مجموعہ کی نہ دنیا کے لئے ان مختلف المظاہر موجودات کی حاجت رہتی ہے اور نہ اس عالم کو ہونے اور موجود کہلانے ہی کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اور پھر کونسا داعیہ اٹھتا ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ ایسی بے معنی اور غیر مفید کائنات کی بنیاد استوار فرمائے۔ (نعوذ باللہ منہ)۔

ان چند سطور سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ اگر اس مادی عالم کو اسی امتیاز شکن التباس میں بے یہ بیتہ چھوڑ دیا جائے۔ اور اس کے اجزاء میں ایسی ہی تلبیس راہ پا جائے کہ جس کے ذریعہ موجودات میں کوئی تفریق، امتیاز اور معرفت باقی نہ رہے تو یقیناً عالم بے معنی اور لغو بھی ثابت ہو جاتا ہے اور خدا کی بے مثال صناعی و قدرت پر ایک بڑا دھبہ بھی آجاتا ہے۔ لیکن اگر اس التباس کے بجائے وہی امتیاز قائم رہے جو ہے اور جس کی وجہ سے عالم کی ہر چیز آج اپنی حد میں پہچانی جا رہی ہے تو یقیناً عالم کی تخلیق بے شمار حکمتوں کا نتیجہ اور خدا کی قدرت کاملہ کا ایک بے مثال نمونہ ثابت ہوگی۔

پس روشن ہو گیا کہ التباس و اختلاط ہی وہ چیز ہے جو کائنات کے وجود کو باطل کرتی ہے اور اس کے بالمقابل امتیاز و تفصل ہی وہ دولت ہے کہ ہر چیز کے وجود کو ثابت اور نمایاں کرتی ہے اگر عالم میں اجناس کے اشتراک کے ساتھ فصول کا امتیاز نہ ہو تو عالم کی ہر ہر شئی لاشئے ہو جائیگی

اور اس کا خیمہ درہم برہم ہو جائیگا۔

الحاصل جس دائرۂ اشتراک میں ان صوری خصوصیات اور شکلی امتیازات کا قدم پہنچ جائیگا وہیں اشیاء عالم عدم کے التباس سے نکلکر وجود کی امتیازی سطح پر آجائینگی اور اپنے اپنے مقصد تخلیق کا افادہ کرنے میں لگ جائینگی۔ گویا عالم میں افادہ و استفادہ، تعلیم و تعلم، اقدام و تفہیم، لین دین رنج و خوشی، اور تمام وہ حالات جو ایک کے دوسرے سے متعلق ہو سکتے ہیں صرف انہی امتیازات اور خلقی تفریقوں کی بدولت پائے جا سکیں گے۔ کیونکہ جب ایک ایک اور دوسرا دوسرا ہوگا تو جب ہی وہ متعدی حالات بھی نمایاں ہو سکیں گے جو ایک کے دوسرے سے متعلق ہیں۔ ہاں اگر کائنات کی ان اشیاء میں سے جو وجود اور مادہ کے لحاظ سے بالکلیہ غیر ممتاز ہیں ان امتیازی خصوصیات اور شکلی و صوری تعینات کو اٹھا دیا جائے تو نہ جزئی جزئی رہیگی نہ کلی کلی بلکہ ساری کائنات ایک متصل واحد شے۔ پھر ان اغراض و منافع کے افادات سے قطعاً محروم ہو جائیگی جو اسکے ممتاز اجزاء سے متعلق تھے۔ پس ہر ہر فرد اور ہر ایک مجموعہ پھر ہر جزئی اور ایک ایک کلی اپنی تکوینی خصائص کی بدولت اپنے وجود اور نمائش کو تھامے ہوئے ہے۔

فصل

ف

دنیا کی مختلف قومیتیں

اور اُن کے بقا و تحفظ کا راز

ٹھیک ان مادی اور تکوینی خصوصیات کی طرح کچھ معنوی خصائص اور باطنی امتیازات بھی ہیں جنھوں نے بنی آدم میں جسمانی صورتوں کے دوش بدوش کچھ معنوی صورتیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ اور اسی لئے انسانوں میں کتنے ہی معنوی مجموعے یا جتھے اور قومیتیں قائم ہوگئیں۔ مسلم قوم، یہودی قوم، ہندو قوم، عیسائی اور یہودی اقوام کی قومیں ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود کس درجہ متفاوت اور مختلف ہوگئیں اور اس طرح ایک وسیع دائرۂ اشتراک میں کتنے ہی اختصاصات نمایاں ہوگئے

لیکن ان مختلف قوموں اور متفرق امتوں کا باہمی فصل و امتیاز بھی بہت سی قومی خصوصیات اور مخصوص آثار ہی پر مبنی ہے۔ جبکہ ان اقوام کے اخلاق و عادات مختلف، ان کا تمدن و تہذیب مختلف، ان کے جذبات، احساسات مختلف تو یہ عادات و ملکات، معاشرت و تہذیب، جذبات و حسیات، طرز اعمال و افعال، طرز سلام و کلام، اوضاع لباس اور اطوار خور و نوش وغیرہ ہی وہ خصوصیات ہیں کہ جنکے امتیاز سے ایک قوم کا امتیاز قائم ہو سکتا اور ایک قوم بالاستقلال قوم کہلائی جا سکتی ہے۔ ہم اگر آج ایشیائی قوموں کو یورپین اقوام سے مختلف کہہ سکتے ہیں (جبکہ وہ نسل و انسانیت میں متحد ہیں) تو صرف اسی وجہ سے کہ جو خصوصیات تمدن و معاشرت اور جذبات و حسیات ایک قوم کی ہیں ان کا دوسری میں وجود نہیں۔ اسلئے لا محالہ ایک قوم کو دوسری قوم سے ممتاز اور جدا ہی سمجھا جائیگا۔

پس جس طرح گذشتہ انفرادی نوعی اور صنفی مجموعوں کو ان کے مادی اور تکوینی امتیازات نے ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا تھا اسی طرح قومی مجموعوں کو قومی خصوصیات یعنی باطنی حسیات

دلی جذبات اور پھر جوارح کے اعمال و افعال نے باہم ممتاز بنا دیا ہے۔
یہ ممکن ہے کہ کسی حد تک قومی تخالف اور قومیتوں کے امتیاز میں ملکی و نسلی اختصاصات اور مزید قوم کی تعینات کو بھی دخل ہو لیکن چونکہ یہ غیر اختیاری امتیازات کسی علم صحیح یا غلط پر مبنی نہ ہونے کے سبب کوئی اہمیت نہیں رکھتے اسلئے اقرار کرنا پڑے گا کہ قوموں کے فصل و امتیاز کی اساس صرف روحانی خصوصیات پر قائم ہے۔
کیونکہ یہ روحانی خصائص ہی وہ زبردست امتیازات ہیں جو بسا اوقات نسلی اور لونی بلکہ کل مادی اور ارضی امتیازات کو متہور کر کے بلا شرکت غیرے قومی وجود کی تقویم کے کفیل و سرمایہ دار بن جاتے ہیں۔
یہی روحانی خصائص جبکہ ایک خاص ترتیب کی ساتھ عالم میں ہویدا ہوتے ہیں تو انکے مجموعہ کا نام مذہب اور دین ہوجاتا ہے اور اس طرح مختلف قومیتوں کی تعمیر انہی مذہبی خصائص کی اساس پر کھڑی ہوجاتی ہے۔ پس جس طرح ادیات میں تکوینی حقائق (حیوانیت، نباتیت اور جمادیت) کے ظہور کے لئے مخصوص شکلوں اور صورتوں کی ضرورت ہے، اسی طرح سلسلہ روحانیت میں شرعی اور مذہبی حقائق کے بروز کے لئے بھی فطرۃً مخصوص ہیئتوں اور ممتاز شکلوں کی حاجت ہے۔ یعنی کوئی مخصوص مذہب جب ظہور کریگا تو اپنی ہی قدرتی شکل پر نہ کہ دوسری مصنوعی اور خود ساختہ شکلوں میں۔ کیونکہ اگر اس کا پیرایۂ ظہور اصلی صورت چھوڑ کر کسی مصنوعی صورت میں آجائے تو پھر ہم اسکو وہی مذہب نہیں کہہ سکتے جو ابھی اس سے پہلے اپنی شکل میں جلوہ پیرا تھا۔

اسلامی ارکان کی شکلیں

اب تم دنیا کے سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر مذہب (اسلام) پر ایک نگاہ ڈالو تو نظر آئیگا کہ روحانیت کے مشترک دائرہ میں اسکی بھی ایک خاص شکل و صورت متعین ہے اور اس کے اجزاء و عناصر کی بھی جس کی وجہ سے وہ دوسرے مذاہب سے بالکل ممتاز و نمایاں ہے۔
اُسکے ہمہ گیر شعبوں (عقائد و تصدیقات۔ اعمال و عبادات۔ معاملات و سیاسیات۔ آداب

و معاشرات۔ سلوک حالات و مقامات) میں سے کسی ایک کو لے لو ہر ایک رکن اور مامور و منہی کا ایک خاص پیرایہ نظر آئیگا۔ جسمیں ہو کر اس کی حقیقت ظہور کر رہی ہے وہ اسی پیرائے اور صورت کے ذریعے سے اپنے جنسی اور غیر جنسی اخوات سے ممتاز اور اپنا مستقل وجود قائم کئے ہوئے ہے۔ نماز کی صورت اور ہے روزہ کی اور۔ حج کا پیرایۂ ظہور اور ہے جہاد کا اور یہ ناممکن ہے کہ نماز کی حقیقت دوڑنے اور بھاگنے یا جنگ و جدل کی شکل میں نمودار ہو۔ جس طرح یہ محال ہے کہ جہاد بالسیف کی حقیقت مصلّی میں حاضر ہو کر سکون کے ساتھ رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ کرنے کی ہیئت میں ظاہر ہو حج کی حقیقت جب ظہور کرے گی تو اسی اپنے جامۂ احرام اور طواف و سعی کی فطری شکل میں نہ کہ خانہ نشینی کے ساتھ آرام سے سونے اور لیٹنے بیٹھنے کی صورت میں روزہ کا مظہر اور پیرایۂ ظہور قدرۃً متعین ہے پس اسکی حقیقت کا ظہور کبھی ہوگا تو اپنی اسی (امساک و صبر) کی صورت میں نہ کہ کھانے پینے اور لذائذ طبعی کی تحصیل کی شکل میں۔ اسی طرح محاسن اخلاق سخاوۃ۔ شجاعۃ۔ مروۃ۔ حلم۔ حیا۔ ایثار وغیرہ اور رذائل اخلاق حسد۔ کینہ۔ طمع۔ بخل وغیرہ کی مکنون حقیقتیں جو ہر انسان کے باطن میں فطرۃً مرکوز ہیں .... جب جوارح پر ظہور کریں گی تو یقیناً اپنی ہی شکل میں نمودار ہوں گی۔ بخل ہمیشہ مال کو روکنے اور نہ دینے کی شکل میں ظاہر ہوگا جس طرح سخاوۃ اسکو خرچ کرنے اور بذل کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ اتفاق کا مستور جذبہ قتل و غارت اور فساد و خونریزی کی شکل میں دنیا پر ظاہر ہوا ہو۔ جیسا کہ کبھی نہیں سُنا گیا کہ اختلاف نے آشتی و صلح اور محبت و پیار کی صورت میں اپنی نمائش کی ہو۔

معاملات و سیاسیات کو لیلو تو ہر ایک معاملہ کی شکل قدرۃً متعین ہے بیع و شرا کی حقیقت یقیناً چوری و ڈاکہ زنی کی شکل میں نمایاں ہو سکتی بلکہ اپنی ہی شکل پر آئیگی۔ نکاح و طلاق کی حقیقتیں اپنے ہی پیرائے اختیار کریں گی نہ کہ دوسری اشیا کے۔

اسی طرح اسلامی معاشرت اور معیشت کے کل شعبے اپنی مخصوص صورتوں ہی کے سبب دوسری معاشرتوں سے ممتاز اور اپنے وجود کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ اسلام کے جزوی شعوب

اور ارکان و اجزاء کی شکلیں ہیں جنکو فطرۃ شرعیہ نے متعین کر دیا ہے۔ جب انکو ترتیب کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو یہ مرتب مجموعہ ہی اسلام کی مجموعی شکل ہو جائے گی یعنی جسطرح ایک انسان کے اعضاء ہاتھ، پیر، سینہ، کمر، چہرہ، مہرہ وغیرہ کی الگ الگ اور ممتاز شکلوں کو قدرۃ نے ترتیب کے ساتھ جوڑ دیا۔ تو اسی انفرادی جوڑ بند سے انسان کی مجموعی ہیئۃ قائم ہو گئی۔

اسیطرح اسلام کے ان اجزاء و اعضاء کی جدا جدا صورتوں کو جبکہ قدرۃ نے ایک خاص ترتیب سے پیوست فرما دیا تو اسی پیوستگی ہی سے اسلام کی مجموعی ہیئۃ قائم ہو گئی۔ یہی اسلام کی مجموعی ہیئۃ و صورت جبکہ ایک انسان پر فائض ہوتی ہے تو اسکی جسمانی صورت کے دوش بدوش اسکی ایک روحانی و مذہبی شکل بھی قائم ہو جاتی ہے اس جسمانی شکل کیوجہ سے اسکو انسان کہا جاتا تھا تو اس روحانی یا اسلامی شکل کی وجہ سے اسکو مسلم پکارا جائیگا۔ اور پھر ایسے انسانوں کے مجموعہ پر جبکہ اس کے اجتماعی احکام کی صورتیں فائض ہوتی ہیں تو اس مجموعہ کو اسلامی قوم کہا جاتا ہے۔

پس یہ اسلام اور اسکی قومیت اسی صورت میں اسلام اور قوم اسلام پکارے جا سکتے ہیں جبکہ اپنی ہی فطری شکلوں کے ساتھ انسانوں میں نمایاں ہوں، اگر یہ ان کی معنوی شکلیں دوسرے اقوام کی قومی و مذہبی صورتوں سے ممتاز رکھی جانے کے بجائے دوسرے مذاہب کی شکلوں سے ملتبس بنا دیجائیں تو پھر ان انسانوں کو مسلم قوم وحدت کی اس مشترکی ہیئۃ کو اسلامی شکل کے بجائے اسی ملتہ و قومیہ کا نام دیا جائیگا جس کی شکل اسکو پہنا دی گئی ہے۔ پس یہ بات کافی روشنی میں آگئی کہ حقائق مذہب کی صورتوں کا امتیاز باقی رکھے جانے ہی سے ان کے وجود کو باقی رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہی صور مذاہب کا امتیاز ہے جس سے ہر ایک ملتہ و قوم اپنے نام سے پکاری جا سکتی اور باقی رہ سکتی ہے۔

قومی امتیازات اور اختلاف مذاہب

پس اب یہ دعوٰی پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ اختلاف علوم و عقائد، اختلاف شرائع و ملل نے دنیا کی متحد الحقیقت اقوام کو پراگندہ کر کے ہر ایک کے لئے ایک جداگانہ امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ اور

امتیازی خصائص جو بے شمار قوموں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں، درحقیقت مذاہب مختلفہ کے عقائد و اعمال میں پنہاں ہیں۔ اگر تمام شرائع۔ تمام ملتیں۔ اور تمام ادیان عالم ایک ہی نقطۂ علم و عمل کی خبر دیتے اور یہ اخلاقی خصوصیات ان میں باقی نہ رہتیں تو پھر یقیناً وہ ادیان نہ کہلاتے بلکہ دین واحد، وہ شرائع نہ کہلاتیں بلکہ ایک شریعت۔ انکو ملل نہ کہا جاتا بلکہ ملت واحدہ اور اسلئے قومیتیں مختلف نہ ہوتیں بلکہ امت واحدہ عالم کی وارث بنجاتی۔

پس قومیت یا قوم درحقیقت اس انسانی مجموعہ کا نام ہے جو کسی خاص ملت، خاص مشرب یا خاص سبیل و صراط کا پابند ہو۔ اور اس مشرب و ملت کی خصوصیات نے (خواہ اعتقادی ہوں یا عملی) اس مجموعہ کو دوسرے انسانی مجموعوں سے الگ اور ممتاز کر دیا ہو۔ اگر قومیتوں کا یہ مایہ الامتیاز اٹھا دیا جائے یعنی خصوصیات فنا کر دیجائیں یا ملتیں اور مشتبہ ہوجائیں تو ظاہر ہے کہ کوئی قوم اور کوئی ملت اپنے نام سے باقی نہیں رہ سکیگی۔

پس جس طرح ایک عیسائی اپنی خصوصیات مذہب کے دائرہ میں ایک یہودی اور بت پرست سے ممتاز ہے۔ ایک یہودی اپنے خصائص ملت کے ذریعہ ایک نصرانی اور وثنی سے علیحدہ ہے ایک بت پرست اپنے مخصوص مشرکانہ حرکات کے سبب سے ایک عیسائی اور پارسی سے جدا ہے۔ اسی طرح ایک اسلامی فرد یا ایک مسلم حیثیت اپنی خصوصیات علم و عمل، اپنے مخصوص دینی عقائد و اعمال اور اپنی ممتاز شریعت الٰہی پر دل سے یقین رکھنے اور جوارح سے عمل کرنے کی بدولت ہی ایک نصرانی، یہودی، ایک وثنی و پارسی اور ایک ملحد و زندیق سے اسی طرح ممتاز ہے جس طرح بینا نابینا سے۔ نور ظلمت سے۔ کھلی ہوئی دھوپ سایہ سے۔ اور زندہ مردہ سے۔ پس جبتک بینائی کی خصوصیات بینا میں ہیں وہ نابینا نہیں ہو سکتا۔ جبتک نور کی خصوصیات نور میں ہیں وہ ظلمت نہیں بن سکتا۔ جبتک دھوپ کی خصوصیات دھوپ میں ہیں وہ سایہ نہیں ہو سکتا۔ اور جبتک زندہ کی خصوصیات زندہ میں ہیں وہ مردہ نہیں ہو سکتا۔ وما یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور ولا الظل ولا الحرور وما یستوی الاحیاء

یجر قصبہ فی النار۔ دیکھا دہ انہیں پہ اپنی دشمریاں کھینچا پھسر رہا ہے۔

پس اب دیکھ لو کہ دین حنیف کا جاہلیہ ہو جانا اور ایک موحد قوم کا مشرک بنجانا جو ایک عظیم الشان انقلاب ہے تشبہ بالغیر کی بدولت کیسی سہولت سے وقوع ہو گیا اور اس تشبہ بالاقوام نے کس طرح ایک مذہب کو مٹا کر دوسرا مذہب اور ایک قدیم قومیت کو فنا کر کے دوسری نوع کی قومیت قائم کر دی۔

پھر اس صدیوں کے پرانے قصہ کو چھوڑ کر قرون روان ہی کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لو تو روشن ہو جائیگا کہ اسی تشبہ بالغیر نے ٹرکی کی شہری آبادی سے کیسے غیر محسوس طریقہ پر اسلامی خصوصیات اچکنی شروع کیں اور یورپ کی اس آزاد تقلید یا تشبہ بالنصارٰی نے ان کی قدامت پرستی کے متمدنوں کو اس درجہ پر پہنچا دیا کہ آج انہیں اسلامی مسائل سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی اور نہ مسلمان کہلانا ہی ان کے نزدیک کوئی قابل وقعت حالت سمجھی جا رہی ہے والعیاذ باللہ

ببیں راست گزین میان چہ بر خواہد خواست

پھر آج اسی تشبہ بالنصارٰی کے جذبات نے کابل کے متمدن حصہ کو زیر و زبر کیا اور اسلامی شعائر محو کر دینے کی تمہید ڈالدی اگر ان آزاد اور بے راہ جذبات نے مذہب مٹا کر نہ رکھ دیا۔ تو منتظر کا بہت جلد انتظار کرنا چاہیے کہ اس خالص اسلامی ملک سے اسلامی خصوصیات ایک ایک کر کے رخصت ہو جائیں نعوذ باللہ۔

پس یہ تشبہ بالغیر ہی تو ہے کہ اسکے جراثیم جس قومی و ملی وجود میں پڑ گئے ہیں۔ وہ قوم و ملت کبھی نہیں پنپ سکی اور آخر کار فنا ہو کر رہ گئی۔

تشبہ کے ان تاریخی انقلابات اور اسکی طبعی رفتار کو دیکھتے ہوئے اب اسکی حقیقت ان مختصر الفاظ میں لائی جا سکتی ہے کہ تشبہ بالغیر فی الحقیقت تجاوز عن الحدود اور ابطال ذاتیات کا نام ہے یعنی فطری حدود سے تجاوز کرنے یا حقیقی حدود کو توڑ دینے کا دوسرا نام تشبہ بالغیر ہے جب غیر کی ساتھ مشابہت بڑھیگی تو بلاشبہ اسکی شکل میں بھی فرق آ جائیگا یہاں تک کہ بالآخر اس تحریب

کے ذریعہ اصلی اور فطری شکل محو ہو جائیگی۔ اور ایک غیر فطری شکل نمایاں ہو جائیگی۔ کیونکہ یہ تخریب خواہ کسی تکوینی محدود میں واقع ہو یا تشریعی محدود میں۔ جب کسی چیز کی حدود ہی باطل ہو جائیں تو محدود کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ فرض کیجئے کہ انسانی حقیقت کی حدود جنمیں محدود رہکر وہ انسان ہے حیاۃ اور ادراک ہیں۔ حیاۃ کے دائرہ میں رہکر وہ حساس بھی ہے اور اسلئے وہ جماد نہیں۔ اسی دائرہ میں وہ حرکت ارادی بھی رکھتا ہے اور اسلئے جامد پتھروں کی طرح ساکن نہیں ہے پھر اسی حد کے اندر وہ نشو ونما کی طاقت بھی رکھتا ہے اور اسلئے وہ کوئی چوب خشک نہیں بلکہ بالیدگی تن ہوتی ہے پس حیوانیت اس کی حقیقت کے لئے ایک حد ہے [illegible] کی روک تھی جس نے اسکو جمادات میں داخل ہونے سے بچالیا اور الگ کر دیا ہے۔ پھر اسکی حقیقت کیلئے دوسرا کنارہ "نطق و ادراک" ہے جس کے دائرہ میں رہکر وہ معقولات کا احساس بھی کرتا ہے۔ وہ ذہین و بلیغ بھی ہے۔ وہ متمدن بھی ہے، وہ سلیقہ مند اور عصمت شعار بھی ہے۔ پھر اسی نے اسکو نباتات و جمادات سے اوپر تمام ابنائے جنس پر فوقیت رکھتا ہے اور ان سے ممتاز بھی ہے۔ اور دوسری حد نے اسکو گدھا اور گھوڑا اور تمام لایعقل حیوانات سے الگ کر دیا ہے۔ پس وہ اپنی انسانیت کو انہی دو دائروں میں رہکر برقرار رکھ سکتا ہے۔

اگر بالفرض اسکی حیوانیت یا حیاۃ کی حد توڑ دیجائے۔ اور اس شکست کے بعد موت کی کیفیات اس میں سرایت کر جائیں تو بلاشبہ ایک ذی ارادہ انسان بے جان پتھر بنکر جمادات میں شامل ہو جائیگا۔ اور اسوقت اسمیں نمو کے بجائے جمود۔ حرکت ارادی کے بجائے اضطراری سکون اور حس کے بجائے بے حسی کی کیفیات نفوذ کر جائینگی۔ اور اسوقت ہم اسکو محض مجازی انسان کہہ سکیں گے۔ اور اگر حیاۃ کی حد باقی رہے لیکن علم و ادراک کا کنارہ ٹوٹ جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ جاندار ہے لیکن ادراک کا کنارہ ٹوٹ جانے سے اس میں علم کے بجائے جہل عقل کے بجائے غفلت۔ عصمت و عفت کے بجائے سبعیت و بہیمیت کے رذائل داخل ہو جائیں اور جب اسکی اندرونی یا ذاتی اشیاء نکل جائینگی تو لامحالہ ان کے بجائے بیرونی چیزیں داخل

ہو کر اسکی حقیقی انسانیت کو فنا کردیں گی۔ کیونکہ کسی چیز کی حد ٹوٹ جانے کی یہی حقیقت ہوسکتی ہے کہ نہ وہ اپنے حدود کی ذاتی اجزا کے لئے جامع رہے اور نہ غیر اشیاء کے داخل کرنے سے مانع

پس جس طرح یہ ایک نہایت ہی رفیع المنزلت تکوینی مجسمہ (انسان) اس تکوینی تشبہ اور خارج از انسانیت اشیاء کے اختلاط سے اپنی حقیقی انسانیۃ کو کھو بیٹھا اسی طرح سلسلۂ تشریع میں اسباب واقوام اور انسانی مجموعے بھی جبکہ خارجی اشیاء کو اپنے اندر دخل کرلینے سے مانع نہیں ہوتے تو وہ یقینا اپنی ذاتی خصوصیات کے لئے جامع بھی نہیں رہتے اور اس عدم منع و جمع کے سبب انکی حقیقی قومیت بھی پامال اور اختلاط و التباس اور لاامتیاز کے سبب سے معدوم ہوجاتی ہے۔ پس کسی قوم کے اپنی اصلی حدود پر باقی رہنے اور دوسری اقوام میں مدغم نہ ہونے کی صورت ہی یہ ہے کہ وہ اس تشبہ یا تخریب حدود یا ابطال ذاتیات یا فساد حقائق کے ہلاکت انگیز دائرہ سے بچائی جائے

(۱) یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے ان عورتوں پر لعنت کی جو مردوں سے اوضاع و اطوار میں تشبہ کرتی ہیں۔ پھر اسی طرح ان مردوں پر جو تشبہ بالنساء کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر دو صنف کی حدود الگ الگ اور ہر ایک سے اغراض۔۔۔ جدا جدا متعلق ہیں اور جبکہ ایک صنف دوسری سے مشابہت پیدا کررہی ہے تو گویا اپنی حدود کو توڑ کر دوسرے کی حدود میں قدم رکھ رہی ہے اور ان منافع و مقاصد کو باطل کرنا چاہتی ہے جو اسکی اسی صنفی صورت سے متعلق تھے کہ جب التباس کے سبب متشبہ صنف کی فطری شکل مٹیگی تو اس سے متعلقہ اغراض بھی فنا ہوجائینگی۔ دیکھو آج یورپ کی متمدن دنیا کی معیشۃ منزلی کا سب سے زیادہ گہرا مرض یہی اختلاط و التباس ہے۔ مغرب کی ایک عورت جو تمام عورتوں کی طرح نوع انسانی کی تکثیر و تربیت کے لئے تھی۔ جو قلوب کے سکون اور دلوں کی مودۃ کے لئے تھی اور جو ایک سلیقہ شعار ماں اور ایک عفت مآب بیوی بننے کے لئے پیدا کی گئی تھی اور جو اسلئے تھی کہ گھر کی چہار دیواری کو اس سے زینت ہو اور نظام خانہ داری اسکے دست و بازو کی حرکت پر قائم رہے آج وہ گھر کا میدان چھوڑ کر جبکہ مردانہ لباس میں کارخانوں تجارت گاہوں اور ٹکٹ گھروں میں مزدوری تلاش کرنے لگی۔ سڑکوں اور تفریح گاہوں کیلئے

الاروتق بتنے لگی۔ اسکولوں اور کالجوں میں مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہوگئی۔ تو انصاف سے بتلاؤ کہ کیا وہی عورت رہی جسکو نسائیت کے لیے وضع کیا گیا تھا کیا اس میں سے نسوانی خصائص نکلکر کتنے ہی مردانہ خصائل اسمیں حلول نہیں کر گئے؟ اور جب ایسا ہوا تو وہ نہ خالص عورت ہی رہی اور نہ بالکل مرد ہی بن سکی۔ بلکہ وہ ایک تیسری جنس ہو گئی جسکو خدا کی فطرت نے نہیں بلکہ انسان کی گمراہی نے پردہ دنیا پر لا کھڑا کیا ہے؟ چنانچہ دکھلو کہ اس تیسری قسم کی عورت کے نہ وہ جذبات ہی رہے۔ جو عورتوں کے لیے قدرت نے منقی حیثیت رکھے تھے نہ انکے وہ فرائض ہی رہے جن کے لیے انکی تخلیق کی گئی تھی۔ انکے محسوسات بدلگئے۔ خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔ اب نہ اس کا عورتوں کا سا چہرہ ہے۔ نہ عورتوں کا سا دل اور وہ اپنی قلب وقالب کو چھوڑ کر کسی دوسرے جون میں آگئی ہے جو نہ عورت کا ہے نہ مرد کا۔ گویا فطرت نے مرد اور عورت کو دو جنس قرار دیکر اور ان میں ہر اعتبار سے تفریق و امتیاز کرنے میں (معاذ اللہ) سخت غلطی کی تھی جسکی اصلاح آج یورپ کے مدبروں نے حریت ومساوات کے نام سے کی۔ یہ جو نوعی اور قوالب وقلوب کا بدل جانا یقیناً اسی حد بندی کے توڑ دینے کا نتیجہ ہے جس کی روک تھام شریعت تشبہ سے کی تھی اور بتلایا تھا کہ یہ اختلاط والتباس اگرچہ ملحدوں کی زبانوں سے حریت و مساوات کا لقب پائے پر اسلام کے نزدیک وہ ایک لعنت اور تخریب وجود ہے۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت تشدد آمیز لہجہ میں اسی تشبہ نسائی کا دروازہ بند فرمایا اور اس پر لعنت فرمائی ہے۔

لعن اللہ الرجل یلبس لبسة المرأة والمرأة تلبس لبسة الرجل (وفی روایة) لیس منا من تشبه بالرجال من النساء ولا من تشبه بالنساء من الرجال (ابوداؤد)

خدا کی لعنت ہے اس مرد پر جو عورتوں کے سے کپڑے پہنے اور اس عورت پر جو مردوں کا سا لباس پہنے۔ (اور ایک روایت میں ہے) وہ مرد ہم میں سے نہیں جو عورتوں سے تشبہ کرے اور نہ وہ عورت ہم میں سے ہے جو مردوں سے تشبہ کرے۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ شریعت نے مصور و پر لعنت کی کیونکہ ایک مصور تصویر کشی اور بت گری کے وقت گویا اپنی مخلوقیت کی حدود کو توڑ کر حد خالقیت میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ اور دونوں حدود کو مشتبہ اور ملتبس بنا دینا چاہتا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے۔

إن أصحاب هذه الصور يعذبون يوم القيمة فيقال لهم احيوا ما خلقتم (وفي رواية) إن أشد الناس عذابا يوم القيمة الذين يضاهون بخلق الله (صحيحين)

یہ تصویر کش لوگ قیامت کے دن عذاب دئے جائیں گے کہا جائیگا کہ اپنی مخلوق (تصاویر) میں جان ڈالو (اور ایک روایت میں ہے) سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن ان لوگوں پر ہوگا جو اللہ کی صفت خلق سے تشبہ کرتے ہیں (گویا خالق بننا چاہتے ہیں)۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ ایک صنف رجال ہی میں باہم بوڑھوں کا جوانوں سے تشبہ کرنا مثلاً اپنے شیب (سفید بالوں) کا اکھاڑنا، جوانوں کے سے شوخ لباس پہننا، کسی سی شوخی و آزادی برتنا انکی طرح لہو و لعب میں وقت گذارنا شرعاً ناپسندیدہ قرار پایا کیونکہ یہ حد شیخت کو (جس سے خاص اغراض متعلق تھیں) توڑ کر حد شباب میں قدم رکھنا ہے اور گویا خیر سے شر کی طرف آنا ہے۔ ہاں اگر جوان بوڑھوں سے تشبہ کریں تو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بڑھنا ہے۔ پس یہ تشبہ ایسا ہوگا جیسے ایک فاسق کسی صالح کے ساتھ تشبہ کرکے حد فسق کو توڑ ڈالے۔ یا کوئی کافر مسلم سے تشبہ کرکے حدود کفر کو توڑ دے اور حدود اسلام میں آجائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تشبہ بالخیر مطلوب ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا۔

خير شبابكم من تشبه بكهولكم وشر كهولكم من تشبه بشبابكم (كنز العمال صفحہ ۱۲۹)۔

تمہارے نوجوانوں میں بہترین جوان وہ ہے جو بوڑھوں سے مشابہت اختیار کرے اور تمہارے بوڑھوں میں بدترین بوڑھا وہ ہے جو جوانوں سے تشبہ کرے۔

(۴) اور پھر یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسکو بھی ناپسند کیا تھا۔ کہ غلام کسی آزاد سے تشبہ اختیار کرے یا باندی آزاد عورتوں میں باعتبار وضع کے ایسی سمجھی جائے کہ حرہ اور آزاد ہیں

امتیاز و معرفت ہوسکے۔ فاروق اعظمؓ نے دفار کو ڈانٹا اور فرمایا۔

القی عنک الخمار یا دفار أتتشبہین بالحرائر | اے دفار اس اوڑھنی کو پھینک۔ کیا تو آزاد عورتوں سے تشبہ کرتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے ہر صنف ہر نوع ہر جماعت اور ہر قوم کو جدا جدا وجود بخشا ہے۔ جس طرح خدائے برحق نے تکوینیات میں ہر ہر ذرہ کو مخصوص حدود عطا کیں اور خاص شکل دی جس سے وہ پہچانا اور پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ تشریع و تدین میں ہر ہر قوم بلکہ تمام ان مسلم طبقوں کو بھی کچھ امتیازی حدود عطا کی ہیں جو اپنی شرعی خصوصیات سے کوئی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ تاکہ ہر طبقہ اور جماعت کے مخصوص اغراض و منافع قائم رکھے جا سکیں۔

ظاہر ہے کہ بوڑھے کا جوان سے زن و مرد کا ایک دوسرے سے اور غلام کا آزاد سے تشبہ کرنا ایک مسلم کا مسلم سے تشبہ کرنا ہے لیکن شریعت اس تشبہ کو بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی وہ نہیں چاہتی کہ ان اسلامی اصناف کی حدود ٹوٹ کر انہیں امتیاز کے بجائے کوئی التباس پیدا ہو جائے۔ جس سے معرفت و پہچان مٹ جائے اور وہ اغراض فوت ہو جائیں جو ان اصناف سے جدا جدا مطلوب تھیں۔

پس جو شریعت اپنے حلقہ بگوشوں کے متفاوت طبقات میں بھی اس مخرب حدود تشبہ کو پسند نہیں کرتی کیا وہی شریعت اسے پسند کرے گی۔ کہ ایک مسلم کافر سے تشبہ کرے۔ ایک محب خدا عدو اللہ سے مشابہت پیدا کرے۔ ایک مطیع سرکش سے جا ملے۔ ایک حقانی حدود والا پاک حدود کو توڑے اور باطل حدود کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ کیا کسی درجہ میں بھی یہ عمل خیر و سعادت کے لئے جائز بن سکتا ہے؟ کیا بھلائی کا کوئی شمہ حیا کا کوئی شائبہ۔ غیرت کا کوئی ادنیٰ جزو اور دینی شرم کا کوئی تھوڑا سا بھی پاس اگر فی الواقع کسی میں موجود ہے اسکی اجازت دے گا کہ ہم ایک طرف اپنی زبان سے محب الٰہی اور مسلم ہونیکا دعویٰ کریں اور دوسری طرف اپنے ہی ہاتھوں اسکی حدود پر تیشہ لیکر کھڑے ہوں۔ ان کو مٹائیں ان کے حکیمانہ اغراض و منافع کو باطل کریں اور ان کی جگہ غیر اسلامی حدود قائم کر دیں۔ تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ (الآیۃ)

فصل

تشبہ کا روایتی اور نقلی نقشہ

قرآن جیسی داعی اتحاد و یگانگت کتاب نے بھی جس نے سارے عالم کو ایک ہی رشتۂ اخوت و مذہب میں منسلک کرنا اپنا واحد مقصد بتلایا اور وحدت توحید کا ساری دنیا کو سبق دیا، اس اختلاف صور و امتیاز مذاہب و اقوام کو (جبتک وہ مذاہب و اقوام ہیں) قائم رکھنے کی سعی کی ہے تاکہ ہر قوم اپنی اپنی حدود میں پہچانی جا سکے۔ اس نے ایک طرف تو سارے انسانوں کو للکار کر کہا لا تفرقوا (اے لوگو تفرقہ مت ہو) اور دوسری طرف اپنا ہی نام فرقان رکھا کہ وہ حق و باطل میں تفریق کر دیتی ہے۔ ایک طرف تو اس نے ساری دنیا کو وصل و ملاپ کی تعلیم دی اور دوسری طرف اپنا ہی نام قول فصل رکھا کہ وہ حق و باطل میں جدائی پیدا کر دیتی ہے۔

چنانچہ اس فارق و فاصل کلام نے نازل ہو کر سلسلۂ تشریع میں اسلام کو کفر سے، امانت کو خیانت سے اور دین حق کو تمام ادیان باطلہ سے بالکل جدا اور ممتاز کر دیا۔

امتوں پر خالق و مخلوق کا فرق ملتبس ہو چکا تھا۔ کسی نے خدا کی مخصوص صفات بندوں میں مان لی تھیں اور کسی نے بندوں کی ناقص صفات خدا میں تسلیم کر لی تھیں۔ اس قول فصل کلام نے تمام مشرکانہ جال توڑ کر توحید کو شرک سے اس طرح الگ کر دیا کہ ان میں کوئی التباس نہ رہا۔ معروف و منکر کی حدود مٹ گئی تھیں۔ امتوں نے معروف کو منکر اور منکر کو معروف گمان کر لیا تھا۔ اس فرقان و فصل نے معروف کی حدود متعین کر کے اسے منکر سے جدا کر دیا۔ معروف کا تو امر کیا اور منکر سے نہی کی۔

طیبات و خبیثات کو فرق امتیں بھلا چکی تھیں۔ اسی کلام ناطق نے ان میں تفریق کر دی۔ طیبات کو حلال کیا اور خبائث کو حرام کیا، پھر اسی فرقان اور قول فصل نے جہاں اسلام

وکفر، معروف ومنکر، طیب وخبیث۔ حلال وحرام اور حق وباطل میں تفریق کی تو اس کے ساتھ ہی دین ان اقوام میں بھی دنیوی واخروی تمیز وتفریق پیدا کر دی جو ان متضاد صفات کے اعتبار سے خیر وشر کی دو جانبوں میں بٹ گئی تھیں۔ تاکہ سعید وشقی۔ نیک وبد۔ مطیع وسرکش۔ مسلم وکافر اور اولیاء رحمن واولیاء شیطان میں باہم کوئی تلبیس واختلاط راہ نہ پائے، کہیں تو اس کتاب مبین نے کہا۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین ۔

کیا ہم مسلمین کو مجرمین کی طرح کر دیں گے۔

کہیں فرمایا کہ مومن ومفسد جدا جدا قومیں ہیں جنمیں کوئی التباس نہیں ہو۔

ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ۔

آیا ہم ایمان اور نیکیاں لانیوالوں کو ان کی برابر کر دینگے جو زمین میں فساد کرتے رہے ہیں۔ یا ہم متقیوں کو فاسقوں جیسا کر دیں گے۔؟

کہیں نیک اور بد کی تفریق بیان کی کہ ان کی موت اور زندگی سب الگ الگ ہونی چاہیے۔

ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلهم کالذین آمنوا وعملوا الصالحات سواء محیاهم ومماتهم ساء ما یحکمون ۔

یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انکو ان لوگوں کی برابر کر دیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے یہ برا حکم لگاتے ہیں۔

کہیں فرمایا کہ نیک کردار اور بدکردار آپس میں ایسے متفاوت ہیں جیسے سوانکھا اور اندھا پس ایک دوسرے کی برابر نہیں ہو سکتا۔

وما یستوی الاعمی والبصیر والذین آمنوا وعملوا الصالحات ولا المسیء قلیلا ما تتذکرون ۔

اور اندھا اور بینا اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور بدکار باہم برابر نہیں ہوتے مگر تم لوگ بہت کم سمجھتے ہو۔

کہیں ارشاد فرمایا کہ عبد مشترک اور عبد غیر مشترک جبکہ دو جداگانہ قومیں ہیں تو وہ ایک کیسے ہو سکتی ہیں!

ضرب الله مثلاً رجلاً فيه شركاء متشاكسون ورجلاً سلماً لرجل هل يستويان مثلاً ۔

اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جنمیں باہم ضدا ضدی ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا ہے کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہے ؟

یعنی فرمایا کہ ایک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا انسان ایک باختیار آدمی کی برابر کیسے ہو سکتا ہے - ؟

ضرب الله مثلاً عبداً مملوكاً لا يقدر على شيء ومن رزقناه منا رزقاً حسناً فهو ينفق منه سراً وجهراً هل يستوون ؟

اللہ تعالے ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ ایک غلام ہے مملوک کہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اور ایک شخص ہے جسکو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔ کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہو سکتے ہیں ؟ -

یعنی فرمایا کہ ایک اپاہج کسی مستقیم الحال کی برابری کیسے کر سکتا ہے -

ضرب الله مثلاً رجلين أحدهما أبكم لا يقدر على شيء وهو كل على مولاه أينما يوجهه لا يأت بخير هل يستوي هو ومن يأمر بالعدل وهو على صراط مستقيم

اور اللہ تعالے ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ دو شخص ہیں جنمیں ایک تو گونگا ہے کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے مالک پر ایک وبال جان ہے وہ اسکو جہاں بھیجتا ہے کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم کرتا ہو اور خود بھی معتدل طریقہ پر ہو ؟

پھر اس فاصل قرآن نے تشریعی امر بھی فرمایا تو یہ کہ اے بندگان الٰہی جبکہ ان تکوینیات کیطرح بسلسلہ تشریعیات بھی دو متضاد چیزوں (حق و باطل) میں فطرۃً آشتی اور یکجہتی ناممکن ہے تو اسی فطرۃ کا اقتضا یہ ہے کہ تم اپنے اختیار سے بھی حق اور باطل کو الگ الگ ہی رکھو اور ان میں اس مہلک اختلاط و اشتباہ کو جگہ مت دو۔

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتكتموا الحق وأنتم تعلمون ۔

حق کو باطل میں مت ملاؤ اور جانتے بوجھتے حق کو مت چھپاؤ۔

پس قرآن باوجود داعی اتحاد ہونے کے دونوں باطل ادیان میں تفریق و امتیاز ہی کا حامی ہے۔

اس کا مطلوب اتحاد وحدت یہ ہے کہ ساری ملتیں منکر اسلام میں مدغم ہو جائیں تمام ادیان جنکو اس کتاب نے منسوخ کر دیا اپنے وجود کو چھوڑ کر اسلام میں آملیں اور اسطرح اُمتیں نہ رہیں بلکہ ایک اُمت اور ادیان نہ رہیں بلکہ دین واحد ہو جائے لیکون الدین کلہ للہ۔ وہ ایسا اتحاد نہیں چاہتی کہ برائی اپنی صورت پر قائم رہتے ہوئے نیکی کے ساتھ رلجائے ظلمت اپنی رُوسیاہی سمیت نور میں آکر ملتبس ہو جائے اور اسطرح نہ حقیقی نیکی رہے نہ بدی نہ ظلمت رہے نہ نور بلکہ کوئی اور تیسری چیز تیار ہو جائے۔ اگر قرآن ایسے اتحاد کو گوارہ کرتا جو التباس حق بالباطل سے نمایاں ہو تو وہ یقیناً یہ بھی گوارہ کرتا کہ نہ قرآن رہے نہ قرآنی اُمت نہ اسلام حقیقی کی دعوت رہے نہ اُمت اسلامی کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ التباس ہی وہ تاریکی ہے کہ جسمیں ہر شے کا اصلی وجود پہلے چھپتا اور پھر باطل ہو جاتا ہے۔

پس یہ مخرب التباس اگر علم حقانی میں راہ پالیتا ہے تو علمی حق و باطل سے امتیاز اٹھا دیتا ہے اور جبکہ عمل حق میں قدم رکھتا ہے تو عمل ثابت کی ذاتی خصوصیات مٹا کر باطل کے ساتھ اسکو رلا دیتا ہے۔ اور اس طرح ہر ایک علمی اور عملی قوم انجام کار اس علم و عمل کے اختلاط اور امتیاز فگن تلبیس سے اپنے قومی وجود کو چھوڑ دیتی اور فنا ہو کر اس دوسری قوم میں مدغم ہو جاتی ہے۔ جس کے علمی و عملی شعائر سے اس نے اپنے علم و عمل کو مخلوط کر لیا تھا من تشبہ بقوم فہو منھم۔

پس ہر صداقت کے مٹنے کا پہلا قدم التباس و اختلاط اور تشبہ ہی ہے اسی لئے آیۃ مزینہ بالا میں پہلے لبس کی ممانعت کی گئی ہے اور پھر گویا اس تلبیس کا اثر بصورت نہی ظاہر کیا گیا ہے جو کتمان ہے کہ اس کی ساتھ ہی حق کی روشنی چھپنے لگتی اور باطل کی تاریکی اُبھر آتی ہے۔

پس قرآن کریم نے ایک طرف تو متعدد واشد سے تلبیس اور تسویۂ حق و باطل سے متعلق اپنی مرضی ظاہر فرمائی پھر اوامر حکم کے ذریعہ انہیں کی ممانعت فرمائی۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ متعدد آیات میں قطع تلبیس کا ایک عملی پروگرام بھی پیش فرمایا جسمیں صرف تشبہ ہی سے نہیں بلکہ بطور سد ذرائع ہر اس حصہ کتہ سے روکا ہے جو تشبہ تک منجر ہو تا کہ مسلم کہ ذریعہ کوئی

صوری یا باطنی اشتراک کوئی مناسبت اور کوئی مشابہت بھی پیدا ہونے پائے۔

ترک موالاۃ

اس نے حکم دیا کہ کوئی مسلم کسی کافر کے ساتھ موالاۃ و مودۃ اور قلبی حب کا تعلق نہ رکھے کیونکہ جب قلب اقلیم تن کا سلطان ہے تو قلبی تعلقات ہی آخر کار انسان کے نیت و ارادہ اور افعال پر بھی چھا جائینگے۔ اور اس طرح ایک مسلم قلباً و قالباً کفار سے ملتبس اور متشبہ ہو جائیگا۔ حالانکہ تلبس و تشابہ قرآنی مرضیات کے صراحۃً خلاف ہے۔ پس ایک جگہ تو اس نے یہود و نصاریٰ سے ترک موالاۃ کا حکم دیا کہ۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء۔	اے ایمان والو تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بنانا۔

پھر اہل کتاب اور عام اہل کفر اور پھر ان لوگوں سے بھی یہ رشتہ موالاۃ منقطع کر دینے کا حکم دیا جو مسائل دین کی ساتھ تمسخر اور استہزا سے پیش آتے ہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزوا ولعبا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء۔ واتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین	اے ایمان والو جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہو جو ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہو ان کو اور دوسرے کفار کو دوست مت بناؤ۔ اور اللہ سے ڈرو اگر تم ایماندار ہو

پھر ایک جگہ فرمایا کہ کافر تو کافر ایک مسلمان تو کسی ایسے آدمی سے بھی رتی برابر محبت نہیں رکھ سکتا جو اللہ و رسول کے برخلاف ہو خواہ کفر کرکے ہو خواہ علانیہ فسق اور ابتداع کا ارتکاب کرکے۔

لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ	جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ و رسول کے برخلاف ہیں گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ اگر کسی اسلامی دل میں بھی موالاۃ کفار اور محبت منکرین کا کوئی شائبہ موجود ہے۔

تو ماننا پڑیگا کہ اسی درجہ میں اسلامی عظمت و محبت کی کمی بھی اس قلب میں جاگزیں ہے، ورنہ پھر اسلام و کفر کا تضاد ہی باقی نہیں رہ سکتا اسی حقیقت کو سمجھکر ارباب حقیقت نے دعویٰ کیا ہے کہ مودۃ کفار سے ایمان میں فساد آجاتا ہے۔ بلکہ سہل ابن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جس کا ایمان و توحید خالص ہے وہ کسی مبتدع سے بھی اُنس نہیں رکھ سکتا چہ جائیکہ کفار سے اور وہ بھی مودۃ و محبت کی شکل میں! اور امام مالک رحمۃ اللہ نے اسی آیت سے قدریہ کی معاداۃ اور ترک مجالست پر استدلال کیا ہے۔ اگر مسلم قلوب میں سے کفار کیجانب سے یہ شدۃ و تغلیظ نکلجائے تو ضرور ہے کہ اس کی جگہ موالاۃ و محبت لے لیگی اور قلبی محبت قائم کرنیکے بعد وہ دن دور نہیں رہتا کہ یہ مسلم فرد بانجام کار اُسی گروہ کفر میں جا ملے اور صورۃ و سیرۃ سے ان کا ہم آہنگ بنجائے۔

قرآن کریم نے اسی ترک موالاۃ کی آیت میں موالاۃ کا نتیجہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ۔

ومن یتولہم منکم فانہ منہم ان اللہ لا یہدی القوم الظلمین ۔	اور جو شخص تم میں سے انکی ساتھ دوستی کریگا بیشک وہ انہی میں سے ہوگا یقیناً اللہ تعالیٰ راہ نہیں دکھلاتا ان لوگوں کو جو اپنا نقصان کررہے ہیں۔

پس ترک مودۃ و قطع موالاۃ کے سلسلہ میں ایک مسلم فرد کا اولین فرض ہی یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے آیاتِ مذکورہ کے ماتحت اہل کفر سے اپنے قلبی تعلقات کا رشتہ کلیۃً منقطع کردے اگرچہ وہ اسکے اقارب و اخوان ہی ہوں اور بالکل اسیطرح منقطع کردے جس طرح ان آیات کے ماتحت ابو عبیدۃ ابن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر باپ سے قلبی تعلقات منقطع کرلئے تھے کہ بالآخر بدر میں خود ہی ان کے قاتل بھی بنے۔ جسطرح اسی تعلیم اشداء علی الکفار کے ماتحت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید ابن عمیر سے قطع مودۃ کرکے خود ہی اُحد میں اُسے قتل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں عاص ابن ہشام کو بدر میں قتل کیا، حضرت علی و حمزہ اور عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہم نے عتبہ ولید بن عتبہ اور شیبہ ابن ربیعہ کو بدر میں قتل کیا۔ جو ان حضرات کے قریبی اقارب تھے اور ایسا کرکے اسلامی غیرۃ اور صلابۃ فی الدین کی کیسی زبردست مثال قائم فرمادی۔ جو ہمیشہ

اُمۃ کو غیرت وحمیت کی دعوت دیتی رہیگی۔

تبرّی | پھر قرآن کریم نے اس پر بس نہیں کی بلکہ حکم دیا کہ اپنی اس ترک موالاۃ اور قلبی تنفر کا عام اعلان بھی کردو تاکہ غیر مسلم تمھارے قلب وقالب میں کوئی طمع نہ رکھ سکیں، جیساکہ اللہ نے اپنے رسول کی برات بھی علی الاعلان پکار دی تھی۔

بیشک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کردیا اور گروہ گروہ بنگئے آپ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔	اِنَّ الَّذِینَ فَرَّقُوا دِینَھُم وَکَانُوا شِیَعًا لَّستَ مِنھُم فِی شَیءٍ۔

صفائی سے یہ تفریق واضح کردی گئی کہ لست منھم (تم ان میں سے نہیں ہو) لست منھم کی حقیقت اس کی ضد انت منھم سے واضح ہوسکتی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ دو شخصیتیں واحد نہیں ہوسکتیں۔ زید اور عمر جب دو ہیں تو ایک نہیں ہوسکتے۔ اسلئے جب یہ کہا جائے کہ میں تجھسے ہوں اور تو مجھسے" تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تو میری نوع سے ہے۔ میرے امور میں شریک ہے۔ مجھ جیسا ہے اور میں تجھ جیسا ہوں۔ تیرا شریک اور تیرا ہمنوع ہوں۔

مسلمانوں کے ذات البین اور ان کے باہمی اتلاف وارتباط کو اسی قسم کے الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے کہ بعضکم من بعض (تمھارے بعض تمھارے بعض سے ہیں) یعنی یہ سب بعض بعض ملکر ایک ہی نوع مقصود کے دو شریک ہیں۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبتہ فرمایا۔

تو مجھسے ہے اور میں تجھسے ہوں۔	انت منی وانا منک

یعنی تیری اور میری ایک بات ہے۔ ہمارا معاملہ واحد ہے۔ ایک خاص حقیقت میں ہم متحد ہیں پس جب یوں فرمایا گیا کہ لست منھم، تو ان میں سے نہیں) تو یہ نفی اسی پچھلے اثبات پر وارد ہوگی یعنی تیری اور ان کی ایک بات نہیں۔ تیرا اور ان کا معاملہ ایک نہیں۔ تو اور وہ کسی نوع مقصود کے دو شریک نہیں بلکہ الگ الگ ہیں۔ اسی حقیقت کو حق تعالے نے فرمایا کہ اے رسول لست منھم فی شیءٍ یعنی تو کسی چیز کے اعتبار سے کفار میں سے نہیں۔ انکا شریک

نہیں ان کی ساتھ متحد نہیں تو جس نوع متصود کا ایک فرد ہے وہ اور ہے اور کفار جس نوع کے
شرکا ہیں وہ اور ہے۔ اسی لئے سورۂ کافرون میں اس تبری و علیحدگی کو واضح کر دیا گیا۔

قل یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون	آپ کہہ دیجئے کہ اے کافرو نہیں تمہارے معبودوں کی پرستش
ولا انتم عابدون ما اعبد ولا انا عابد	کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبودوں کی پرستش کرتے ہو۔ اور
ما عبدتم ولا انتم عابدون ما اعبد	نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرونگا۔ اور نہ تم میرے
لکم دینکم ولی دین ۰	معبود کی پرستش کروگے تمکو تمہارا بدلہ ملیگا۔ اور مجھکو میرا بدلہ ملیگا

یہ تبری و برارت ایسی ہی ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی کافر قوم اور اپنے کافر باپ سے
فرمائی تھی۔

واذ قال ابراھیم لابیہ وقومہ اننی براء	اور اسوقت کو یاد کرو جبکہ ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم
مما تعبدون	سے فرمایا کہ میں اس چیز سے بیزار ہوں جنکی تم عبادت کرتے ہو

اور ایسی ہی ہے جیسا کہ قوم ابراہیم نے مشرکین سے یہ کہکر تبری کی تھی کہ۔

انا براٰء منکم ومما تعبدون من دون اللّٰہ	ہم تم سے اور جنکو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں

پس جبکہ انبیا علیہم کا طریقہ کفار سے تبری اور اجنبیت کا اعلان کر دینا ہے تو ان کے پیرو و حلقہ
بگوش کیوں اسی روش کی رہبری پر مجبور نکئے جائینگے۔ آخر رسول نے اپنا ہی طریقہ تو ان کے
سامنے پیش کیا ہے۔ جس کی پیروی کے وہ مدعی بھی ہیں۔

بہرحال قلب اور لسان دونوں کے ذریعہ سے کفار کا تعلق مسلمین سے منقطع کرا دیا گیا
اور یہی دو چیزیں انسان میں اصل ہیں۔

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ		فلم یبق الا صورۃ اللحم والدم	

ترکیبل پھر اسی پر بس نہیں کیگئی بلکہ قلب و زبان کیطرح عام افعال و جوارح میں بھی مسلموں کو غیر
مسلموں سے الگ اور ممتاز ہی رکھا گیا ہے۔

تاکہ مسلمان نہ ان کے کسی عملی پروگرام کے پابند بنیں اور نہ کسی آواز پر اٹھ سکیں

۵۷ آدھا آدمی زبان ہے اور آدھا دل۔ آگے سوائے خون اور گوشت کے کچھ نہیں۔ درکیا باقی دما رہتا

پیچھے پیچھے ہولیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہرون علیہما السلام کو فرمایا گیا تھا کہ جب تمہیں علم اور استقامت راہ کی دولت دیدی گئی ہے۔ تو پھر تم کج راہوں اور جاہلوں کے پیچھے مت ہولینا۔

خدائے کریم نے حضرت موسیٰ و ہرون کو خطاب کر کے فرمایا کہ۔

فاستقیما ولا تتبعٰن سبیل الذین لا یعلمون	تو تم دونوں مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جنکو علم نہیں

ہی وصیت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے ہوئے ہرون علیہ السلام کو کی تھی کہ تم اپنی ہی صلاح و اصلاح پر قائم رہنا اور مفسدوں کی پیروی مت کرنا۔

وقال موسیٰ لاخیہ ھرون اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین	اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہدیا تھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا۔

پس جبکہ انبیاء علیہم السلام کا طریق ایک صراط مستقیم ہے جس پر وہ علم و صلاح اور استقامت کیساتھ قائم ہیں تو پھر غیر مسلموں کے سبل متفرقہ جہل و فساد وغیرہ کے اتباع کی انکی اور ان کے پیروں کو حاجت ہی کیا ہے۔ مسلمانوں کو تو یہ زریں اصول دیدیا گیا ہی۔

ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔	بلاشبہ یہ دین میرا راستہ ہی جو کہ مستقیم ہی سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔

ترک معاملات | پھر شریعت اتنی نے صرف اتنی ہی مجانبت اور قطع اختلاط و التباس پر کفایت نہیں کی بلکہ اس امتیاز و تفریق کو اور زیادہ یوں نمایاں فرما دیا کہ ان سے معاملات بھی منقطع کرلو۔ اگر اسلامی سطوت و صولت اور اس کی حکومت کا علم لہرا رہا ہو۔ محاکم شرعیہ اور صدالتیں کھلی ہوئی ہوں تو خلافت راشدہ اور حکومت دینیہ کے دستور العمل کے موافق مسلمان کفار سے استعانت و استمداد نہ کرینگے سیاسیات میں انکو شریک نکریں گے اور اشتراک عمل سے حتی الامکان بچینگے۔

کیونکہ یہ معاملات کی ظاہری شرکت بھی آخر کار وہی موالاۃ و موانست پیدا کر دیتی ہے۔ فاروق اعظم

رضی اللہ عنہ کی گہری سیاست نے اس پر کافی روشنی ڈالدی۔ ممالک خلافت میں اُن کا یہ فرمان شائع کیا گیا تھا کہ۔

ان لا تکاتبوا اھل الذمۃ فتجری بینکم وبینھم المودۃ ولا تکنّوھم واذلوھم ولا تظلموھم۔ (اقتضاء الصراط المستقیم)

ذمیوں کیساتھ مکاتبت کا تعلق مت رکھو کہیں تم میں اور ان میں اس بات سے مودۃ نہ پیدا ہوجائے اور انکو پناہ مت دو اور تم انکو ذلیل رکھو مگر ان پر تعدی نہ کرو۔

نیز فاروق اعظم اور ابو موسیٰ اشعری کے اس مکالمہ سے اس قطع تعلقات و معاملات اور اسکی پنہانی حکمت کا پورا پورا اندازہ ہوسکیگا جس کو امام احمد بن حنبل نے اپنے مسند میں سند صحیح کی ساتھ روایت فرمایا ہے۔

ابو موسیٰؓ قلت لعمر رضی اللہ عنہ ان لی کاتبا نصرانیا۔

میں نے کہا عمر رضی اللہ عنہ سے میرے یہاں ایک نصرانی کاتب ملازم ہے۔

عمرؓ مالک قاتلک اللہ اما سمعت اللہ یقول یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض الا اتخذت حنیفا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تجھے کیا ہوا خدا تجھے غارت کرے کیا تو نے اللہ کا یہ حکم نہیں سنا؟ کہ یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔ کیوں نہ تو نے کسی مسلمان کو ملازم رکھا؟۔

ابو موسیٰؓ یا امیر المؤمنین لی کتابتہ ولہ دینہ۔

میں نے کہا اے امیر المومنین میرے لئے اسکی کتابت ہے اور اس کیلئے اسکا دین، مجھے اس کے دین سے کیا تعلق؟۔

عمرؓ لا اکرمھم اذ اھانھم اللہ ولا اعزھم اذ اذلھم اللہ ولا ادنیھم اذ اقصاھم اللہ تعالیٰ۔ (اقتضاء الصراط المستقیم)

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میں انکی تکریم نہیں کرونگا جنکی اللہ نے توہین کی اور میں انکو عزت نہ دونگا جنکو اللہ نے ذلیل کیا۔ اور میں انھیں مقرب نہ بناؤں گا جنکو اللہ نے دور کیا ہے۔

اس پر مغز مکالمہ سے (جو فاروق اعظمؓ جیسے بیدار مغز خلیفۂ رسالت کی ہدایت پر مشتمل ہے) یہ واضح

ہو جاتا ہے کہ۔

(۱) جبتک کوئی مضطرانہ ضرورت داعی نہ ہو اصل یہی ہے کہ غیر مسلمین سے استعانت اور وہ بھی ایسی کہ جس میں ان کی تکریم ہوتی ہو قرین عقل و دین نہیں۔

(۲) یہ عذر کسی طرح قابل سماعت نہیں کہ ہمیں صرف ان کی خدمات درکار ہیں نہ کہ ان کا مذہب۔ کیونکہ اس تحصیل خدمات کے ذیل میں ان کیساتھ معیت اس شدۃ و تغلیظ کو کم یا محو کردیگی جو ایک مسلمان کا اسلامی شعار بتلایا گیا ہے۔ اور یہی قلۃ تغلیظ بالآخر مداہنت، چشم پوشی اور اعراض عن الدین کا مقدمہ لیکر رہتے ہی شرعی منکرات کے نشو و نما کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

(۳) فاروق اعظم اور ابو موسیٰ کے بعد کوئی شخص ان جیسا تدین نہیں لا سکتا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ابو موسیٰ تو کفار کی خدمات حاصل کرنے سے روکدئے جائیں اور ہمیں نہ روکا جائے۔ مانا کہ ایک شخص پختہ اور راسخ الایمان بھی ہے اور اس اشتراک عمل سے اس میں کوئی تزلزل بھی نہیں آ سکتا لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایسی ذمہ دار ہستی کا اشتراک عمل عامۂ مسلمین کے لئے بڑی سے بڑی استعانت اور زیادہ سے زیادہ اختلاط کا دروازہ کھولدے عوام اپنے لئے اس طرز عمل کو حجت شمار کریں اور اس طرح یہ اختلاط و التباس عام ہو کر ناقابل تدارک مفاسد کا باعث بنجائے۔

(۴) جس مخلوق کی اسکے خالق نے تکریم نہ کی اور اسکے لئے عزت کا کوئی حصہ نہ [illegible] اس خالق کے پرستاروں کی غیرت و حمیت کے خلاف ہے کہ وہ اسکا اعزاز کی تکریم کریں۔ وہ جسے پھٹکار دے یہ اسے پیار کریں۔ ورنہ یہ تو پھر اسلام کے نام سے شعائر اللہ کی توہین اور خود افعال باری ہی کی صریح تکذیب ہو جائیگی۔ نعوذ باللہ منہ۔

(۵) اسلام میں سیاست کوئی مستقل شے نہیں بلکہ محض دین۔ سیاست [illegible] گوارہ کیجاتی ہے لیکن اگر سیاست ہی کا کوئی شعبہ تخریب دین یا شعائر دین سے چشم پوشی کا ذریعہ بننے لگے تو بیدریغ اسکو قطع کرکے دین کی حفاظت کی جائیگی۔ ورنہ وہ صورت خلافت نہ [illegible]

اور انقلاب ماہیت لازم آجائیگا۔ کہ وسیلہ مقصود ہو جائے اور مقصود وسیلہ کے درجہ پر بھی نہ رہنے

ترک مجالست | پھر اسی تحفظ خود اختیاری اور دفع التباس میں شریعت نے ایک قدم اور بڑھایا کہ غیر مسلموں کے ساتھ مجالست بھی ترک کر دی جائے اگر ان کے ساتھ نشست و برخاست اور میل جول عام ہو جائے تو رفتہ رفتہ اسی موالاۃ و مودۃ کی تولید کا پھر قوی اندیشہ ہے جس سے مسلمانوں کے مخصوص قومی و مذہبی شعائر التباس کی زد میں آجائیں اور دین ضائع ہو جائے کیونکہ مجالس کفر و نفاق کا عام انداز تحقیر دین، اور استہزا آیات اللہ کیساتھ مسلمانوں کو ان کے دین سے بدظن بنانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسلئے قرآن نے فرمایا۔

وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بھا ویستھزأ بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ	اور اللہ تعالٰے تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہیہ کیساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو۔ جبتک کہ وہ اور کوئی بات شروع نہ کر دیں۔

نیز جبکہ ایک منافق محض ظاہری میل جول اور زبانی جمع و خرچ کی بنا پر مسلم کہلایا جا سکتا ہے تو کیا ایک مسلم حیثیت پر اس ظاہری شارکت کفار یا مجالست کے سبب کفر و نفاق کے احکام جاری نہیں ہو سکتے ؟ قرآن کریم نے خود ہی فیصلہ فرما دیا کہ۔

انکم اذا مثلھم۔ } اس حالت میں تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے۔

ترک اہواء | ان تمام مراتب کے بعد ترقی کر کے شریعت نے اس رشتۂ اختلاط کے اس تار کو بھی قطع کر دیا کہ مسلمان غیر مسلموں کی اہواء جہالت اور خواہشات ضلالت پر کان بھی دھریں یا انکے نفسانی جذبات کا کچھ بھی احترام کریں۔ کیونکہ اگر ان کی اہواء نفس میں سے تم نے کسی ایک خواہش پر بھی لبیک کہا تو یہی ایک پیروی تمہارے نئے تو دوسری پیرویوں کا ذریعہ اور ان کے لئے دوسری خواہشات پیش کرنے اور ان کو منوانے کا ایک قوی وسیلہ اور حجۃ بن جائیگی، اور نہ معلوم انجام کار ان کی اہواء پر اسلام کا کسقدر سرمایہ طوعاً و کرہاً نثار کر دینا پڑے پس

قرآن کریم نے بتلایا کہ ان جاہلوں کی پیروی کرنا حق کی پیروی سے باز رہنا ہے۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ۔

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهواء الذين لا يعلمون ۔

پھر ہم نے آپکو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلئے۔

کہیں فرمایا

ولا تتبع اهواءهم عما جاءك من الحق ۔

اور جو سچی کتاب آپکو ملی ہے اس سے دور ہو کر انکی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجئے۔

کہیں فرمایا۔

وان احكم بينهم بما انزل الله ولا تتبع اهواءهم واحذرهم ان يفتنوك عن بعض ما انزل الله اليك ۔

اور ہم حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے، اور انکی خواہشات پر عملدرآمد نہ کیجئے اور ان سے یعنی انکی باتوں سے احتیاط رکھئے کہ وہ آپکو خدا کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بچلا دیں۔

کہیں ڈرا کر فرمایا۔

ولئن اتبعت اهواءهم بعد ما جاءك من العلم ما لك من الله من ولي ولا واق۔

اگر آپ ان کے نفسانی خیالات کا اتباع کرنے لگیں بعد اسکے کہ آپ کے پاس علم پہنچ چکا ہو تو اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانیوالا۔

بہرحال ان آیات میں اہواء کفار کی پیروی کو اس بلاغت کے ساتھ روکا گیا کہ ساتھ ہی کہیں علم کہیں۔ حق کہیں۔ شریعت کہیں ما انزل اللہ کے کلمات سے استطرادا رہنمائی بھی فرمادی کہ اتباع کے لئے یہ چیزیں کافی ہیں۔ پھر کیا ان کے بعد بھی کسی چیز اور وہ بھی اہواء کفار کی پیروی کی حاجت رہجاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کی خواہشات کا اتباع کرکے تو تم علم کے بجائے جہالت۔ حق کے بجائے باطل۔ شریعت کے بجائے سبل متفرقہ۔ اور ما انزل اللہ کے بجائے القاء شیطانی کے دلدل میں پھنس جاؤگے۔ اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر۔

اعلان بغض وعداوۃ

قلب وقالب کے تمام رشتے منقطع کر دینے کے بعد اب شریعت نے ایک اور

قدم اٹھایا کہ احباء الہی (مسلمین) ان اعداء اللہ سے اگر کوئی تعلق رکھیں تو وہ عداوۃ اور بغض فی اللہ کا تعلق ہونا چاہیے نہ کہ حب و دوستی کا کیونکہ وہ خدا کے دشمن ہیں اور مسلمانوں کو وہ سب کے سب اور ان کا قائد اعظم (شیطان) اپنی انتہائی عداوۃ کے سبب جہنم کیطرف دھکیل دینا چاہتے ہیں۔

ان الشیطان لکم عدوٌ فاتخذوہ عدوا انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحاب السعیر	یہ شیطان بیشک تمہارا دشمن ہے سو تم اسکو دشمن ہی سمجھو وہ تو اپنے گروہ کو محض اسلئے بلاتا ہے تاکہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے ہو جاویں

نیز جبکہ یہ عداوۃ کسی نفسانی داعیہ سے نہیں بلکہ محض اسلئے قائم ہوئی کہ انھوں نے حق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اسکی بنا محض صداقت پر ہوئی اسلئے بے دھڑک اس عداوۃ کا اعلان بھی کر دو تاکہ اعداء اللہ تم کو اپنی طرف کھینچنے اور ملانے سے مایوس ہو جائیں جیسا کہ قوم ابراہیم نے اعلان کیا تھا اور صاف طور پر پکار دیا تھا کہ۔

کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہٗ	ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کیلئے عداوت و بغض ظاہر ہو گیا جبتک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

پھر فرمایا کہ اعلان عداوۃ کے بعد خاموش نہ بیٹھ جاؤ بلکہ حسب استطاعت سامان جنگ کی تیاری بھی جاری رکھو تاکہ یہ عداوۃ اسوقت تک مستحکم رہے جبتک وہ کفر سے تائب نہ ہو جائیں۔

واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترہبون بہ عدو اللہ وعدوکم وآخرین من دونہم	اور ان کافروں کیلئے جسقدر تم سے ہو سکے ہتیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اسکے ذریعے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں۔ اور انکے علاوہ دوسروں پر بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ [illegible] مسلمانوں کی آمادگی عداوۃ پھر اعلان عداوۃ پھر ابقاء عداوۃ کے سلسلہ ان کا خطاب ہی بارگاہ الہی سے اشداء علی الکفار نازل ہو گیا۔ اور وہ خدا کی فوج کے سپاہی بن گئے جنکو خدا نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے چن لیا۔ پس مسلم و کافر دو فوجیں ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا اور جنگ آزما رہی ہیں ہمیشہ کی

امداد جنود ملائکہ اور ایک کی جنود شیاطین سے ہوتی رہی۔ پھر ہمیشہ پہلے کے حق میں نتیجۂ فوز و فلاح کے دروازے کھولے گئے اور دوسرے کے لئے انجام کار ذلت و پھٹکار کی رسوائی متعین رہی ہے۔

ترکِ تشبّہ | پس ایسی دو متباین و متضاد نوعوں اور ایسی دو محارب قوموں میں یکجہتی یا تمثّل و تشابہت آخر کس راہ سے آسکتی ہے؟ اور کیسے ہوسکتا ہی کہ شریعت الٰہی اُدھر تو قلبِ مسلم سے موالاۃ تک نکالدے۔ اُن سے تبرّی اور عداوت کے اعلان تک کا حکم دیدے۔ معاملات اور مجالست تک ترک کرادے۔ حتّٰی کہ دور سے ان کی کسی ہوائے نفس پر کان دھرنے کی بھی اجازت نہ دے اور ادھر اسکی اجازت دیدے کہ ہم سراسر کفار کے مشابہ بنجائیں۔ صورۃ و سیرۃ میں ان کی شبیہ ہوجائیں اون کی اور ہماری ظاہری ہیئتیں۔ اُن کا اور ہمارا لباس، وضع و اطوار اور عام معاشرت یکساں ملتی جلتی ہو جائے؟ ناممکن اور محال ہے حتّٰی یلج الجمل فی سم الخیاط نہیں بلکہ ان دونوں نوعوں کا باہم برسرِ عداوت اور جنگ آزما ہوتا ہی خود اس کا مقتضی ہی کہ صرف باطن ہی نہیں بلکہ انکی ظاہری ہیئتوں اور ان کے اوضاع لباس وغیرہ میں بھی کامل امتیاز اور تفاوت ہونا چاہیئے۔ کیونکہ میدان مصاف میں جبکہ دو دشمنوں کی فوجیں باہم گتھ چکی ہوں اور بے پناہ تلواریں ٹکرا کر شور محشر بپا کر رہی ہوں تو اس شور و شغب اور تداخل افواج کی محشر خیزی میں صرف ظاہری ہیئت و لباس اور پلٹنوں کی جنگی وردی ہی اپنے اور پرائے میں امتیاز پیدا کرتی ہے جس سے محبت و عداوت کا صحیح معیار قائم رہتا ہی ورنہ اگر اس ہنگامہ آرائی میں کوئی سپاہی دشمن کی وردی پہنکر اپنی فوج میں آئے اور ہزار زبان سے چلا کر بھی اعلان کرے کہ وہ دشمن کی فوج میں سے نہیں ہی پھر بھی اُس پر یہی حکم لگایا جائیگا کہ وہ انہی میں سے ہے کہ من تشبہ بقوم فھو منھم اور اس لئے جو رویہ دشمن کے سپاہیوں سے برتا جاوے گا وہی اس کے ساتھ بھی عمل میں لایا جائیگا۔ لیکن اسی حالت میں اگر دشمن کی فوج کا ایک سپاہی اپنے حریف کی فوجی وردی پہنکر ان میں آملے تو وہی بے پناہ تلواریں اسکے سر پر

سایہ رحمت ہوجاتی ہیں۔ اور اسوقت تک اس کو ضرور نجات ملجاتی ہے۔ جبتک کہ اس کا نفاق آشکارا نہو جائے۔

پس یہ دو فوجیں (مسلم و کافر یا حزب اللہ اور حزب الشیطان) جبکہ مذہبی میدان میں برسرپیکار ہوں اور ازل سے بھتی آرہی ہوں تو کیوں ایسا نہونا چاہئے کہ انکی فوجی وردی، انکے اسلحۂ جنگ اور انکے امتیازی نشانات وغیرہ بھی ایک دوسرے سے ممتاز اور سرتاسر نمایاں رہیں تاکہ دنیا کے اس بین الاقوامی اژدہام میں دوست اور دشمن کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا جائے۔ اور کیوں ایسا نہو کہ ایک سپاہی اپنی وردی تبدیل کر دینے پر اسی فوج کا آدمی سمجھا جائے جسکی وردی اُس نے اوپر چسپت کرلی ہو۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے حزب اللہ کی وردی تو لباس التقویٰ تجویز فرمائی اور حزب الشیطان کی لباس الجوع والخوف کیونکہ پہلے لشکر (حزب اللہ) کی ساری زور آزمائی نہ ملک گیری کے لئے ہے نہ جوع الارض اور ہوس زر کے لئے بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے اسلئے یہ لشکر مخلوقات اور اس کے نمائشی جاہ وجلال سے مرعوب ہونے کے بجائے صرف خدا سے ڈرتا اور تقویٰ کی راہ چلتا ہے۔ باطناً اُس کے عزائم و افکار اور ظاہراً اُس کے متقیانہ افعال ولباس وغیرہ سے تقویٰ وتدین ہی کی روشنی چھنے لگتی ہے گویا تقویٰ اسکے قلب وقالب پر لباس کیطرح چھا جاتا ہے۔

ولباس التقویٰ ذٰلک خیر ذٰلک من آیات اللہ لعلہم یذکرون۔	اور تقویٰ کا لباس یہ اُس (عام لباس) سے بڑھکر ہے اور یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ شاید یہ لوگ بیدار ہوں

اور دوسرے لشکر کی تمامتر جد وجہد لوجہ اللہ ہونے کے بجائے جبکہ محض جوع الارض اور حظوظ دنیا کی تحصیل کے لئے ہوتی ہے اسلئے وہ ایک خدا سے ڈرنے کے بجائے ماسوی کے ایک ایک ذرہ سے کانپتا اور لرزتا ہے یحسبون کل صیحۃ علیہم اور اسی لئے قلعوں اور دیواروں کی آڑ لیکر اپنے بودے اسلحہ کی نمائش کرتا ہے لا یقاتلونکم جمیعا الا فی قری محصنۃ او من وراء جدر بأسہم بینہم شدید

---

۵ ہر مل پیکار کو اپنے ہی اوپر خیال کرنے لگتے ہیں ۱۲ ۵ یہ لوگ سب ملکر بھی تم سے نہ لڑیں گے مگر محفوظ بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں

پس جوع الارض آسے جنگ پر ابھارتی ہے مگر خوف مخلوق آخر کار پھر ناکامی کے غار میں ڈھکیل دیتا ہے گویا جوع اور خوف نے لباس کی طرح اسکے ظاہر و باطن کا احاطہ کرلیا ہے۔ اسی لئے اسکے تمام اعمال و افعال اور لباس وغیرہ پر اسی جوع و حرص اور طمع و خوف کا اثر نمایاں رہتا ہے۔

پس قرآن کریم نے ان دونوں فریقوں کی ظاہری مماثلت و مشابہت تک قطع کر دینے کا حکم بھی صادر فرمادیا تاکہ مطیع و نافرمان اور صادق و کاذب الگ الگ نمایاں ہوجائیں۔ اور مسلمانوں کے علم و عمل کے کسی شعبے میں کفار کے لئے کوئی جگہ اور طمع باقی نہ رہ سکے۔ فرمایا۔

الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیہم الامد فقست قلوبہم وکثیر منہم فاسقون۔

کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ انکے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اسکے سامنے جھک جاویں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاویں جنکو انکے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر ایک زمانہ دراز گذر گیا پھر انکے دل سخت ہوگئے اور بہت سے آدمی انمیں کے کافر ہیں۔

پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ۔

اے ایمان والو تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دی تھی۔

ایک جگہ فرمایا۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا۔

اے ایمان والو تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جو منکر ہوگئے۔

پہلی آیت میں عام اہل کتاب دوسری میں یہود اور تیسری میں بالعموم تمام کفار کے مثل ہوجانے ان کی عام موافقت اور ان کے اتباع سے روکا گیا۔ اس انقطاع مثلیت سے اسی تشبہ و مماثلت کا انقطاع مقصود ہے۔ ورنہ مطلقاً کفر سے روکا جانا ان الفاظ میں بھی ممکن تھا کہ کفر نہ کرو یا کافر نہ ہو۔ لیکن کافر ہوجانا اور چیز ہے اور کافروں کی مشابہت پیدا کرنا

ان کی سی شکل و صورت بنانا اور ہے۔ ایک کھلے ہوئے غیر مسلم سے جس کی ہر روش اسلام سے الگ ہے۔ اسلام اور اسکی مخصوص اوضاع و اطوار کو اتنا نقصان نہیں پہونچ سکتا جتنا کہ اس مسلم سے جو کافر نما بنکر اسلام کا مدعی ہو۔ کیونکہ پہلی صورت میں اسلام و کفر الگ الگ نمایاں رہتے ہیں اور اس دوسری صورت میں عملاً و قولاً اسلام و کفر میں التباس کا دخل آجاتا ہے جس سے کسی کا وجود بھی نمایاں نہیں رہسکتا بلکہ دونوں معدوم سے نظر آنے لگتے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ التباس کا نتیجہ عدم اور فنا محض ہے۔ وجود و بقا اگر ہے تو صرف امتیاز ہی میں ہے۔ پس آیات مندرجۂ بالا میں اسی التباس اسلام بالکفر اور اسی مشابہت مسلم بالکافر کو مٹا کر ان میں باہم تفریق و امتیاز پیدا کیا گیا ہے۔ تاکہ اسلام و کفر اور نور و ظلمت مخلوط نہونے پائیں۔ اور ہر ایک اپنی اپنی حقیقت کو الگ الگ نمایاں کرتا رہے۔

فصل

قرآنی آیات کے بعد اب قرآن کی حقیقی اور اولین تفسیر یعنی ذخیرہ احادیث میں منع تشبہ کی حیثیت اس کی اہمیت اور اس کی شدید ترین ضرورت دیکھئے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے معرکۃ الآرا خطبے میں صحابہ کے ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے منع تشبہ کی بات کیسا اہتمام بالشان ارشاد فرمایا۔

الا کل شیٔ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع۔	خبردار ہوجاؤ کہ جاہلیت کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے مسل دی گئی۔

جاہلیت کی تفصیل ہم نے ایک مستقل فصل میں کی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ جاہلیت درحقیقت اسلام کے سوا تمام مذاہب کا عنوان ہوگیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اسلام کے آورده احکام کے سوا ہر وہ دستور العمل جو رائج تھا (یا ہو) میرے قدموں کے نیچے مسل دیا گیا۔ اور اس کا کوئی وجود و اعتبار نہیں رہا اب کسی کو حق نہیں کہ اسلامی دستور العمل چھوڑ کر اسے اختیار کرے اور خیر کا مستحق رہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

ابغض الناس الی اللہ ثلثۃ ملحد فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنۃ جاھلیۃ ومطلب دم امرء بغیر حق۔	سب سے زیادہ مبغوض خدا کے نزدیک تین قسم کے لوگ ہیں وہ جو حرم میں زندقہ و الحاد کا کام کرے۔ دوسرے وہ جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے تلاش کرے۔ اور تیسرے وہ جو کسی شخص کا خون ناحق بہالے۔

یہ جاہلیت کے طریقوں کا اسلام میں ڈھونڈنا اور اسلامی طرق چھوڑ کر ان پر عمل پیرا ہونا ہی تشبہ بالاغیار ہے۔ پھر ایک جگہ نہایت صریح الفاظ میں بصورت ضابطہ و کلیہ ارشاد فرمایا۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلے اللہ	ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ، فرمایا رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم من تشبہ بقوم فہو منہم

(رواہ ابو داؤد)

علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی قوم کے ساتھ صورتاً بھی مشابہت اختیار کی وہ انجام کار اسی قوم میں سے حقیقۃً بھی ہو جائیگا۔

یہ حدیث ہر اعتبار سے تشبہ کا ایک عام و تام قانون ہے۔ حدیث ثابت کرتی ہے کہ ظاہری تشبہ جس قوم کیساتھ بھی کیا جائے ابرار و اخیار کیساتھ کیا جائے یا اشرار و فجار کے ساتھ خیر میں یا شر میں، معاشرت میں ہو یا تہذیب و تمدن میں۔ انجام یہ ہے کہ متشبہ اپنا وجود چھوڑ کر اسی قوم کے وجود میں مدغم ہو جاتا ہے جس کے ساتھ اس نے تشبہ کیا تھا۔

پس حدیث مذکور نے روشن کر دیا کہ تشبہ بالغیر جس طرح حسی اور تکوینی طور پر محو و فنا کا ذریعہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح شرعی طور پر بھی وہ فنا شرائع کا ایک موثر طریقہ ہے۔ اور یہ بات کافی طور پر واضح ہو گئی کہ ہر چیز خواہ کونی ہو یا شرعی اپنی ہستی یا خودی باقی رکھنے کے لئے ترک تشبہ کے اصول کی محتاج ہے۔

ورنہ درصورت تشبہ اسکی وہی ہستی باقی نہیں رہ سکتی جو ابتک تھی بلکہ متشبہ بہ کی ہستی میں صورتاً سیرتاً اور حکماً مدغم ہو جائیگی۔ چنانچہ فقہاء امت اسی حدیث کی تخریج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر کوئی جن سانپ کی صورت میں آجائے تو اسکے قتل کر دینے میں کوئی باک نہ کیا جائے من قتل دون زیہ فدمہ ھدر ؎ کیونکہ سانپ اور بچھو کو شریعت نے حرم میں بھی پناہ نہیں دی اور جبکہ ایک جن نے اس غیر معصوم الدم مخلوق سے تشبہ کیا تو وہ انہیں میں سے ہو گیا۔ پس اسپر سانپ بچھو ہی کے احکام جاری کر دئے جائیں گے۔

اسی حدیث کو سامنے رکھکر صحابہ و تابعین اور تمام سلف نے ہر قسم کی متشبہانہ تبدیل ہیئت اور تبدیل معاشرت کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ ... حدیث سے استدلال کرتے رہے۔ حضرت حذیفہ ابن الیمان کو ایک دعوت میں بلایا گیا۔ آپ نے جاکر دیکھا کہ اس تقریب

؎ جو شخص اپنی ہیئت کے سوا کسی دوسری ہیئت میں قتل کر دیا گیا تو اسکا خون ضائع ہے جس کا قصاص نہیں آتا۔ منہ

میں کچھ بھی رسمیں ادا کی گئیں ہیں تو واپس ہو گئے اور فرمایا کہ من تشبہ بقوم فہو منہم (اقتضاء الصراط المستقیم)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ گدی کے بال منڈانے کیسے ہیں۔ فرمایا کہ یہ تو مجوسیوں کا فعل ہے و من تشبہ بقوم فہو منہم (اقتضاء)۔

اسی حدیث کے ماتحت حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ قلما تشبہ رجل بقوم الا کان منہم (بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی شخص نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی ہو اور آخر کار اسی قوم میں سے نہ ہو گیا ہو۔

اسی حدیث کے ماتحت خطاب ابن معلی مخزومی نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تھی جسکو ابن حبان صاحب صحیح نے اپنی کتاب روضۃ العقلاء میں نقل کیا ہے کہ تشبہ باھل العقل تکن منھم وتصنع بالشرف تدرکہ (داناؤں کی مشابہت اختیار کر تو تو انہی میں سے ہو جائیگا اور بناوٹ سے بھی اگر شرف کی طرف جھکیگا تو تو شرف حاصل کرلے گا۔

فتشبہوا ان لم تکونوا مثلہم	ان التشبہ بالکرام فلاح

پس شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ حدیث کم از کم تشبہ مطلق کی حرمت کے لئے ایک زبردست استدلال ہے۔ بلکہ اگر اس کے ظاہر پر جمود کیا جائے تو وہ تشبہ بالکفر کی حرکات کو کفر اور متشبہ کو کافر بعینہٖ اسی طرح ثابت کرتی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ و من یتولہم منکم فانہ منھم ایک موالات کنندہ کو کفار میں شامل کر رہی ہے۔ گو کفر دون کفر کے قاعدہ سے اس کفر میں شدید و خفیف درجات پیدا ہو جائیں لیکن اسمیں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مطلق تشبہ بالکفار ایک مسلم کو کفر کی سرحد پر پہنچا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ کیونکہ جب اسلامی حدود تشبہ کے حربوں سے توڑ دی جائیں گی (خواہ وہ معاشرتی ہوں یا تمدنی۔ تعبدی ہوں یا محض اخلاقی) تو یقیناً یہی شکستہ حدود کے راستوں سے ان کی اضداد (کفریہ حدود) قائم ہوتی جائیں گی۔ اور اس طرح اس متشبہ کا اسلامی قصر چند دنوں میں منہدم ہو جائیگا۔ (العیاذ باللہ)

ملہ یعنی اے لوگو کریموں سے تشبہ کرو اگر تم ان جیسے نہیں ہو کیونکہ کرام کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا بھی فلاح [illegible]

فصل

تشبہ اور قرون سلف

قرآن و سنت کی ان کھلی کھلی تصریحات کے بعد اب ہم چاہتے ہیں کہ امت کے برگزیدہ قرون کا وہ طرزِ عمل پیش کریں جو مسئلہ تشبہ پر پوری روشنی ڈال رہا ہے، تاکہ اس مستمر عملی نقشہ سے مسطورہ تصریحات اور بھی زیادہ منکشف اور شدید ہو جائیں۔ ان قرون میں سب سے زیادہ مقدس دورِ صحابہؓ کا ہے، اور صحابہ کے اس بہتر دور میں سیاستِ فاروقی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے منعِ تشبہ میں نہایت قوت سے کام لیا اور اس اصول کے ذریعہ اسلامی خصائص کی پوری حفاظت فرمائی۔ انہوں نے نہ صرف کلیات اور اصول ہی کا تحفظ کیا۔ بلکہ جزئیات کے تحفظ میں اصول سے بھی زیادہ مستعدی دکھلائی۔ کیونکہ جزئی تعارض ہی سے انجام کار اصولی تناقض بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں ایاکم و محقرات الذنوب (اپنے چھوٹے گناہوں سے بہت بچو) کیونکہ صغائر کو حقیر سمجھنے ہی سے کبائر پر جرأت و جسارت ہو جاتی ہے۔ پس فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے معمولی معمولی چیزوں میں بھی تشبہ بالاغیار سے بچانے کے احکام نہایت قوت سے صادر فرمائے۔ ہم ان کے ایک طویل فرمان کے، جو آذربائیجان کی عرب رعایا کے نام بھیجا گیا ہے، چند جملے پیش کرتے ہیں جن میں قومی خصائص کے بقاء پر کس شدت کے ساتھ زور دیا گیا ہے اور کن قومی روایات کو یاد دلایا گیا ہے۔

اما بعد فاتزروا وارتدوا وانتعلوا وارموا بالخفاف والقوا السراویلات وعلیکم بلباس

بعد الحمد والصلوٰۃ، اے لوگو! ازار و چادر استعمال کرو، چپل پہنو، خفاف ترک کرو، پاجاموں کے دلدادہ مت ہو

ابیکم اسمٰعیل و ایاکم و التنعم و زی العجم وعلیکم بالشمس فانها حمام العرب و تمعددوا واخشوشنوا واخلولقوا واقطعوا الرکب وارموا الاغراض وانزوا۔ (کنز العمال)۔

اپنے جد امجد اسمٰعیل علیہ السلام کا ہی لباس اپنے لئے ضروری سمجھو۔ اور خبردار تنعم اور عجمیوں کی ہیئت و مشابہت اختیار کرنا حمام کی ضرورت ہو تو دھوپ کو کافی سمجھو یہی عرب کا حمام ہے خلاف شوخی اختیار کرو۔ کھردرا کپڑا پہنو پھٹے پرانے سے پرہیز کرو

لباس میں۔ معاشرہ میں اور تمام شعبہائے زندگی میں اسی پچھلی روش پر پختہ رہنے کی ہدایت دینے سے غرض وہی قومی امتیاز قائم کرنا اور تشبہ و التباس کا مٹانا ہے۔ یہ کلمات بتلاتے ہیں کہ جزئی حدبندی صحابہ میں کس قدر اہتمام سے رائج تھی جو آج تنگ نظری پر محمول کیجا رہی ہے اس ذہنیت کے انقلاب کا کیا ٹھکانا ہے کہ آج یہ تحفظ حدود قومی رواداریوں کے خلاف ایک تنگ نظری سمجھی گئی ہے اور کل تک یہی چیز اسلام اور اسلامیوں کے نشو ونما کی اصل ضمانت دار تھی۔ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھ لو کہ ان جزئیات کے ذریعہ جسقدر بھی قوۃ سے یہ قدمار تنقیدی مسلک تحدید مشرب اور تقیید خیالات و افکار پر عامل رہے اسیقدر سطوت و جلال کی روشنی ان کے اس تنگ مطلع سے ابھرتی رہی۔ اور ماضی کو چھوڑ کر اب حال کو بھی دیکھ لو کہ آج اس اصطلاحی آزادی روشن خیالی۔ فراخدلی اور وسیع المشربی کا دائرہ جسقدر وسیع ہوتا جا رہا ہے اسیقدر قومی عزۃ اسلامی شوکت اور مسلمانوں کے حقیقی رعب و وقار کا دائرہ سمٹتا بھی آرہا ہے۔

اگر یہ زمانہ حال کی رواداری اور فراخدلی ہی کچھ شوکتوں اور ترقیوں کی پردہ دار ہوتی تو پھر آج کے دور دورہ مسلمان ان رواداریوں کے بل بوتے پر اس سے کہیں زیادہ شوکت و عظمت دنیا پر قائم کر لیتے جتنی کہ (معاذ اللہ) چودہ صدی پیشتر کے ان تنگ نظروں نے دنیا کو دکھلائی تھی نہ کہ روز بروز ابھرنے کے بجائے یوماً فیوماً پست ہوتے چلے جاتے؟۔

پس اس ماضی وحال کو ضرب دینے سے حاصل ضرب یہی نکلتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنے قومی و مذہبی وجود کو اسوقت تک قائم نہیں رکھ سکتی جبتک کہ اس اصول بقاء و تحفظ (منع تشبہ) پر کاربند نہو۔ ہاں مگر یہ کہنا بھی ہرگز مبالغہ نہیں کہ یہ اصول انتہائی حکمت

کیا تھا اسلام ہی نے قائم کیا اور وہی اپنی حقیقی راست بازی کی بدولت اس کا خدا ہے بھی ہے کہ تمام حدود کو مٹا کر صرف اپنی ہی حدود قائم رکھنے کا عزم باندھے ہوئے ورنہ اگر کوئی باطل اور تنگ مذہب لغویت آمیز چھوت چھات کے ذریعہ اسلام کے ہوتے ہوئے بھی اس کی نقل اتارنے لگے تو اس کا پول زیادہ دیر تک ڈھکا نہیں رہ سکتا۔

خلافت فاروقی میں جب کہ عجمی ممالک کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور عربوں میں عجمیوں کا اختلاط بڑھنے لگا تو بہت زیادہ اس تحفظ حدود کا اہتمام کیا گیا۔ کیونکہ بہت عربوں کا اپنی خالص اور سادہ عربیت کو چھوڑ کر عجمیوں کی نظر فریب معاشرت کا شکار ہو جانا پھر اپنی حقیقی سادگی کو اس التباس کی بدولت کھو بیٹھنا بعید نہ تھا۔

پس جہاں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے روز بروز فتوحات کو ترقی دی وہیں تو تاکید تھی اپنی عمیق سیاست سے ادھر تو اسلامی خصوصیات اور مذہبی امتیازات باقی رکھنے اور عجمیوں سے مشابہ ہو جانے کی مسلمانوں کو تاکید کی جیسا کہ پہلے فرمان سے واضح ہو چکا ہے اور ادھر ان غیر مسلم عجمیوں کو بھی اپنے فرامین سے چونکا دیا کہ وہ بھی بجائے خود مسلمانوں کی زی و ہیئت اختیار نہ کریں تاکہ ہر قوم اپنی اپنی خصوصیات میں نمایاں رہے اور اس طرح اس مہلک التباس کا سد باب ہوتا رہے۔

مندرجہ ذیل فرمان فاروقی میں جو تمام قلمرو خلافت میں مشتہر کیا گیا اور عملاً نافذ ہوا ذمیوں سے بطور شرائط یہ عہد لیا گیا تھا کہ۔

ان نوقر المسلمين ونقوم لهم من مجالسنا ان ارادوا الجلوس ولا نتشبه بهم في شيء من ملابسهم قلنسوة او عمامة ولا نعلين ولا فرق شعر ولا نتكلم بكلامهم ولا نتكنى بكناهم ولا نركب السروج ولا نتقلد السيوف ولا نتخذ شيئا

ہم مسلمانوں کی توقیر کریں گے۔ ہم اپنی مجلسوں سے کھڑے ہو جائیں گے اگر وہ بیٹھنے کا ارادہ کریں گے۔ ہم ان کی ساتھ کسی بات میں مشابہت اختیار نہیں کریں گے۔ ٹوپی ہو یا عمامہ۔ جوتے ہوں یا سر کی مانگ۔ ہم ان کا سا کلام نہ کریں گے۔ ہم ان کی سی کنیتیں نہ رکھیں گے۔ ہم زین پر گھوڑے کی سواری نہ کریں گے۔ تلوار نہ لٹکائیں گے۔

من السلاح ولا نحمله ولا ننقش خواتيمنا بالعربية ولا نبيع الخمور وأن نجز مقادم رؤوسنا وأن نلزم زينا حيثما كنا وأن نشد الزنانير على أوساطنا وأن لا نظهر الصليب على كنائسنا ولا نظهر صليبا ولا كتبا في شيء من طرق المسلمين ولا أسواقهم ولا نضرب بنواقيسنا في كنائسنا إلا ضربا خفيفا ولا نرفع أصواتنا مع موتانا ولا نظهر النيران معهم في شيء من طرق المسلمين (وفي رواية حرب) ولا نرفع أصواتنا في الصلوٰة ولا القراءة في كنائسنا فيما يحضره المسلمون ولا نخرج باعوثا ولا شعانينا وأن لا نجاورهم بالجنائز ۔ (اقتضاء الصراط المستقيم ابن تیمیہ)

کوئی ہتیار نہ رکھینگے۔ ہم اپنی مہروں کے نقش عربی میں کندہ نکرائینگے۔ شراب کا بیوپار نکریں گے۔ ہم طرہ و سر کے اگلے حصہ کے وہ بال ہیں جو بطور فخر و تزئین کے رکھے جاتے ہیں کٹوا دینگے۔ جیسا کہ آج بھی انگریزی بال کے نام سے یہ طرہ مشہور ہے۔ ہم جہاں بھی رہینگے اپنی ہی وضع پر رہینگے ہم اپنے کمر و نپر زنار باندھینگے۔ گرجوں پر صلیب کو بلند نہ کرینگے مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں نہ ہی کتابوں اور صلیب کو ظاہر کرینگے۔ ہم اپنے گرجوں میں ناقوس نہایت ہلکی آواز سے بجائینگے۔ ہم اپنے مردوں کے ساتھ آوازیں نہ اٹھائینگے۔ مسلمانوں کی سڑکوں میں ہم اپنے مردوں کیساتھ آگ نہ لیجائینگے۔ (یہ مجوس کے متعلق ہے کیونکہ وہ آگ کے پجاری ہیں) دوسری حرب کی روایت میں ایک روایت خلال کہ ہم اپنی نمازیں بلند آواز سے نہ پڑھینگے۔ اگر مسلمان کہیں قریب ہوں تو گرجوں میں قرات بھی زور سے نہ پڑھینگے۔ اور نہ ہم دعاء استسقا کیلئے ہجوم لیجائینگے۔ اور نہ ہم اتوار کی عید اور اس کا جشن منائینگے۔ ہم مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن بھی نہ کریں گے۔

اس فرمان فاروقی سے جو اصول ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ دو قوموں میں باعتبار مذہب و معاشرۃ کھلا امتیاز ہونا چاہیے تاکہ ہر قوم کے حق و باطل کو اسکی اصلی صورت میں پرکھا جا سکے اور ہر دو کے اصول و فصول دائرہ التباس و اختلاط میں مدغم نہ رہیں۔ جیسا کہ مذہبیات کے دائرہ میں عبادات اور شعائر مذہب جیسے صلیب کا بلند کرنا۔ عیسائی نماز و دعاء استسقاء ہجوم کا گشت وغیرہ ان سب میں امتیاز و تفریق پیدا کر دی گئی۔ اور ادھر معاشرۃ کے سلسلہ میں لباس

نام کُنیت ۔ سواری ۔ سر کے بال ۔ کلام و تکلم وغیرہ میں تفریق و تمیز دی گئی ۔ پھر اسیطرح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عام بلاد اسلامیہ میں ایک فرمان کے ذریعہ یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ ۔

کفار مسلمانوں کا لباس نہ پہنیں تاکہ وہ انسے الگ پہچانے جا سکیں	ولا یلبسوا لبس المسلمین حتی یعرفوا ۔

گویا قوموں کو باہمی معرفۃ و تمیز اسلام کا ایک اہم مقصد تھا جسپر اُسکے ابتدائی قرون میں کافی زور دیا جاتا تھا ۔ اور یہ محض اسی لئے کہ ہر قوم اپنی قومیت پر باقی رہے ۔ اور اپنے ہی نام سے پکاری جا سکے ۔ اور اسطرح ہر قوم کی حق یا باطل خصوصیات جُدا جُدا دیکھی جا سکیں ۔ گویا جسطرح مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ کفار کے شعار و باطنی تشبہ نہ کریں تاکہ اسلامی اوضاع و اطوار مشتبہ ہو کر مٹنے نہ پائیں اسیطرح حکومت اسلامی کفار کو بھی مجبور کرے گی کہ وہ کفر پر رہتے ہوئے مسلمانوں کا سا لباس نہ پہنیں تاکہ یہ کافرانہ ظلمت اپنی آمیزش سے اسلامی نور کو مکدر نہ بنا سکے ۔ ان مذکورہ فرامین فاروقی سے جہاں مسئلہ تشبہ کے متعلق ایک پائدار روشنی دستیاب ہوتی ہے ۔ وہیں نمایاں طور پر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد اپنی شوکت کو قائم کرنے کیساتھ ساتھ کفر کی عزۃ و شوکت کو پامال کرنا بھی ہے کیونکہ اسکے نزدیک عزۃ و شوکت صرف حق اور اہل حق کے لئے ہے وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون ۔ اور ذلت و پستی باطل کیلئے جو تمام ملل کفر میں منتشر ہے والکفر ملۃ واحدۃ وہ چاہتا ہے کہ زمین پر ایک خدا کا تخت عدالت بچھے اور ما انزل اللہ کا قانون نافذ ہو ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ۔ اُس کے نزدیک خدائی قانون کے سامنے منسوخ قوانین یا انسانی دساتیر کا بڑھنے کی سعی کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک حُسن مجسم کے سامنے کسی قبح مجسم کا دعوائے جمال کرنا یا ایک نور محض کے سامنے کسی ظلمۃ خالص کا چمکنے کی خواہش رکھنا ۔ پس کفر کے انہی غیر طبعی حوصلوں کو مٹا دینے کیلئے اُس نے تلوار بھی اٹھائی ۔ اور سلطنت و سیاست کے اصول بھی قائم کئے ورنہ اگر نفس کفر کو دنیا سے جبرًا نابود کر دینا اس کا مقصد ہوتا تو لا اکراہ فی الدین اور افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین اور لست علیہم بمصیطر اور لست علیہم بوکیل کے کوئی معنی ہی نہ رہتے ۔ پس وہ کفر کو تو جبرًا مٹانا نہیں چاہتا مگر شوکت

کفر کو جبراً مٹا دینا اسکی ایک فطری خواہش ہو۔ اور ایک ایسی ہی خواہش ہے جیسا کہ سچائی جھوٹ کو بے فروغ کر دینے کی خواہشمند ہو یا روشنی تاریکی کو بے وقعت بنا دینے کی آرزومند۔

پس مسلمان کیلئے ہر وہ فعل غیر فطری اور غیر شرعی ہوگا جس سے کفار کی کوئی عام وقعت قائم ہو۔ اُن کا اعزاز بڑھے۔ اور ان کی تائید ہونے کے سبب ان کے حوصلے بڑھ جائیں جنسے کفریہ عزائم ترقی پذیر ہونے لگیں۔

اسی لئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے فرامین کے ذریعہ عزت و شوکت کے تمام مراتب تو اسلامی شعائر کے لئے مخصوص فرما دیئے اور ذلت و پستی کے سارے ہی درجات کفر او اہل کفر کیلئے اور جبکہ اسلام کے یہ اہم مقاصد بہت زیادہ منع تشبہ ہی سے پورے ہو سکتے تھے تو سیاست فاروقی نے اسی اصول کو پیش پیش رکھکر جہاں مسلمانوں کو کفر کے بدترین شعائر کے اختلاط سے روکا وہیں کفار کو بھی بحالت کفر اسلام کے پاک شعائر سے الگ کر دیا۔ کیونکہ کسی جانب سے بھی تشبہ ہو بہرحال تلبیس و عدم امتیاز کیلئے کافی ہے۔ اور عدم امتیاز ہی قومیتوں یا مذہبوں کیلئے مہلک اور محا وجود ثابت ہو چکا ہے۔

پس گویا منع تشبہ کا اصول جسطرح ایک سچے مذہب کے بقاء و تحفظ کا ضامن ہے۔ اسیطرح اسکی عزت و شوکت اور خودداری کے قائم رکھنے کا بھی کفیل ہوا۔ اور اس لئے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسکی اہمیت اسلام کی نظر میں کیا ہوگی۔

ہاں مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ توہین و تذلیل اور چیز ہے اور ظلم و بے انصافی اور چیز ہے۔ اعزاز و تذلیل فرق مراتب پر مبنی ہے اور ظلم و تعدی تعصب محض پر۔ پس اعزاز و تذلیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے درجے نمایاں ہو جائیں۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ مسلمان حکام اس توہین و تذلیل کو سامنے رکھکر غیر مسلموں پر جور و تعدی بھی جائز تصور کرنے لگیں۔ ہرگز نہیں کبھی نہیں ہو سکتا کہ ذمیوں کو ذلیل سمجھکر ان کے جائز حقوق کو بھی جو بہ حیثیت رعایا ہونے کے وہ رکھتے ہیں پامال کر دیا جائے۔ کیونکہ جانی و مالی حقوق میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مساوات رکھتے ہیں۔ کسی طرح جائز نہیں کہ ان میں بدامنی پھیلائی جائے

کسی طرح روا نہیں کہ ان کے نزاعات میں صحیح اور منصفانہ فیصلہ نہ دیا جائے۔ کسی طرح مسلمانوں کو حق نہیں پہونچتا کہ ان کے مال ومتاع پر ہاتھ ڈالیں۔ کسی طرح حلال نہیں کہ ان کو غیر معصوم الدم سمجھیں۔ جسطرح اُن کے لئے یہ جائز نہیں کہ غیر مسلموں کو اعزاز و اکرام میں مسلمانوں کا ہمسر کر دیں۔ یا ان کی ایسی وقعت و عزت کرنے لگیں کہ کفر و اہل کفر کی اہمیت اسلامی قلوب میں جاگزیں ہو جائے۔ پس انصاف بلا استثنا سب کے لئے ہے۔ اور عزت و عظمت صرف مومنوں اور اہل اللہ کے لئے ہے۔

تشبّہ اور قرن تابعین

جس طرح خلافت راشدہ کے طریق سیاست اور عام صحابہ رضوان اللہ علیہم کے قبول و امتثال نے منع تشبّہ کی اس حبل المتین کو مضبوط تھامے رکھا اور اسطرح دنیا کو اپنے قرن کی برکات اور محیر العقول کامیاب نتائج کے صفحات پڑھنے کا موقعہ دیا اسیطرح قرن ثانی میں اجلّہ تابعین نے بھی قرن اول کے بعد خلافت (راشدہ) کا پورا پورا عکس تابعین میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ عادل نے اپنے طرز عمل سے پیش کیا اور اسی نوع کی سعادات و برکات سے دنیا کو متمتع ہونے کا موقع دیا جو قرن اول کے مخصوص و ممتاز نشانات تھے۔ تفریق حق و باطل، امتیاز حسن و قبح میں انہوں نے پورا زور خلافت صرف کیا۔ اور کھرے کو کھوٹے سے الگ رکھا۔ شدۃ علی الکفار اور شفقۃ علی المسلمین کا قرآنی اصول ان کا ہر ساعۃ راہنما رہا۔

ذیل کا واقعہ ان کے امتیاز آفرین طرز عمل تقشف فی الدین صلابت فی الاسلام اور منع تشبّہ کے اصول کی غیر مداہنانہ پابندی کا شاہد عدل ہے۔ اس عمر ثانی نے بھی انہی جزئیات میں پیش دستی کی جن میں عمر اول نے کی تھی۔ رضی اللہ عنہما ورضیا عنہ۔

دخل ناس من بني تغلب على عمر بن عبد العزيز وعليهم العمائم كهيئة العرب فقالوا يا امير المؤمنين الحقنا بالعرب قال فمن انتم قالوا نحن بنو تغلب قال اولستم من اواسط العرب قالوا نحن نصارى قال عليّ بجلم فاخذ من نواصيهم والقى العمائم وشق رداء كل واحد شبرا يحتزم به وقال لا تركبوا السروج واركبوا على الاكف ودلوا ارجلكم من شق واحد

بنی تغلب کے کچھ لوگ عمر بن عبد العزیز کے پاس حاضر ہوئے جو عربوں کے مانند عمامے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا امیر المومنین ہمکو عربوں ہی میں شمار کر لیجئے (یعنی اہل عرب کے حقوق دیجئے) فرمایا تم کون لوگ ہو؟ عرض کیا کہ ہم بنی تغلب ہیں۔ فرمایا کہ کیا تم عربوں میں سے نہیں ہو؟ (یعنی ظاہری لباس وغیرہ تو تمہارا تمکو عرب بتلا رہا ہے) عرض کیا کہ نہیں ہم تو نصاریٰ ہیں۔ فرمایا کہ میری قینچی لاؤ۔ جانے سو [illegible]

ان کی پیشانیوں کا طرہ کاٹ دیا۔ ان کے عمامے گرا دئے۔ اور ہر ایک کی چادر میں سے بالشت بھر چوڑی پٹی اتار تاکہ ان کی کمروں میں پٹکے کی طرح باندھ دی جائیں۔ جو نصاریٰ کا خاص امتیازی شعار تھا اور عربوں سے ان کو تمیز کرتا تھا۔ پھر فرمایا کہ زینوں پر مت سوار ہو بلکہ پالانوں پر اور سوار ہو کر اپنے دونوں پیر ایک طرف لٹکا دو۔

اس فرمان سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں جنکا اہتمام اپنے عہد میں حضرت عمر ثانی نے فرمایا۔ ایک امتیاز۔ اور قطع مشابہت کہ مسلمان اور نصرانی باہم متمیز رہیں۔ چونکہ خیر کا دور دورہ تھا اور مسلمانوں کے اقتدار و عروج کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اسلئے مسلمانوں کے قلوب تو تشبہ بالنصاریٰ سے یکسر خالی تھے۔ لیکن طبعی طور پر فطرۃً مفتوح قومیں فاتح کی ہر روش پر مائل ہوتی ہیں اسلئے نصاریٰ چاہتے تھے کہ عربوں کا لباس پہنیں۔ عمامے باندھیں۔ اپنے زنار اور پٹکے کھولکر مسلمانوں کی وضع و تراش اختیار کریں۔ طرہ اور سر کے بال رکھیں۔ پس مسلمانوں کی طرف سے تو تشبہ کا دروازہ بند تھا لیکن غیر مسلموں کی طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ نصرانی صورۃً عرب بنکر تلبیس کے ذریعہ اپنے مذہبی و سیاسی حقوق اہل حق کے سے قائم کرنے کی تدابیر عمل میں لائیں اسلئے حضرت عمر ثانی نے پیش بندی کر دی۔ فرمان بھی جاری کر دیئے اور عملاً اسی مجلس میں عربیت کے امتیازی نشانات بھی نصرانیوں سے چھین لئے۔

دوسرے یہ کہ اس امتیاز اور قطع تشبہ سے جہاں انہوں نے اسلام کی شوکت قائم کی وہیں کفر کی شوکت کو پست بھی کر دیا۔ جیسا کہ طرہ کاٹ دینے پالان پر چڑھنے کا حکم دینے اور زین پر دونوں پیر ایک طرف لٹکا کر سوار ہونے کا حکم دینے سے ظاہر ہو رہا ہے۔

پھر فرامین کے ذریعہ اسی قسم کے اور بھی تیسری احکامات اس خلیفہ عادل نے قلمرو سلطنت اسلامیہ میں شائع کر دیئے۔ معمر کہتے ہیں کہ عمر ابن عبدالعزیز نے عروہ بن محمد عامل یمن کو یہ فرمان لکھا کہ۔

ان امنعہم من قبلک فلا یلبس نصرانی

اپنی طرح یہی ممانعت کردو کہ کوئی نصرانی قبا

الجباه ولا ثوب خز ولا عصب وتقدم في
ذلك اشد التقدم واكتب فيه حتى لا يخفى
على احد نهي عنه وقد ذكر لي ان كثيرا
من النصارى قد راجعوا لبس العمائم و
تركوا لبس المناطق على اوساطهم واتخذوا
الوفر والجمام وتركوا التقصيص ولعمري
ان كان يصنع ذلك فيما قبلك ان ذلك
بك ضعف وعجز فانظر كل شئ كنت نهيت
عنه وتقدمت فيه الا تعاهدته واحكمته
ولا ترخص فيه ولا تغير عنه شيئا ۔

عرب اور ریشمین کپڑا جو محض مفاخرت کی چیز ہو، اور
چھال کا کپڑا نہ پہنے - اسکے نفاذ کے بارے میں شدت کے
ساتھ پیش قدمی کرو - اس حکم کو لکھکر شائع کرو تاکہ
کسی پر ان باتوں کی ممانعت مخفی نہ رہجائے - مجھے
ذکر کیا گیا ہے کہ نصارٰی پھر عمامے باندھنے لگے ہیں اور
انہوں نے اپنی کمر پر پٹکے (جو ان کا مخصوص نشان
تھا) باندھنا چھوڑ دیا ہے - اور سر پر بال اور پٹے رکھنے
لگے ہیں اور بال کٹوانا چھوڑ دیا ہے - خدا کی قسم اگر یہ
سب کچھ تمھارے علاقہ میں ہو رہا ہے تو یہ تمھاری
کمزوری اور عجز ہے - پس ان ہدایات میں سے
کسی بات کو اسکے سوا مت چھوڑو کہ اس کی کافی نگرانی اور سختی کا عمل کر دو اور ڈھیل مت دو - مگر کسی پر تعدی
و ظلم بھی مت کرو!

اس فرمان و حکم کا حاصل وہی ہے جو تحذیر تغلب کا حاصل تھا یعنی امتیاز، اور ترک تشبہ کو بچانا
اور التباس و تشبہ کو جو قوم کے ملی و قومی وجود کو باطل کرتا ہے۔ فنا کرنا کل آتا ہے اور ثابت ہو جاتا
ہے کہ منع تشبہ پر قرن اول و ثانی میں یکساں زور دیا گیا ہے اور ان قرون میں اسپر زور دیا جاتا ہی
اسلامیت کے عروج اور کفر و اہل کفر کی پستی و کمزوری کا باعث ہوتا رہا ہے۔

تشبہ اور قرون اجتہاد

تبع تابعین سے عموماً ارباب اجتہاد و آئمہ مستنبطین کا دور شروع ہوتا ہے جو ارباب مذہب ہوئے اور جنکا دامن سنبھالکر مخلوق نے اپنے دین کو اختلاف و تضاد اور ہوائے نفس سے بچایا۔ اس قرن میں بھی تشبہ کی اہمیت وہی رہی جو پچھلے قرون خیر سے ہوتی آرہی تھی یعنی مذاہب اربعہ نے منع تشبہ کی پوری روک تھام کی۔

حنابلہ حنبلیوں کا مسلک حافظ ابن تیمیہ کی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" سے بھی واضح ہے نیز دمیاطی حسن السیر میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے حنابلہ کی مشہور کتاب الانتصار سے ان کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے۔

من تزیا بزی کفار من لبس غیار او شد زنار او تعلیق صلیب بصدرہ حرم ولم یکفر

جس نے کفار کی سی ہیئت بنائی کہ زنار باندھ لیا یا چھاتی پر صلیب لٹکالی تو حرام فعل کیا مگر کافر نہ ہوا۔

بہر حال تشبہ بالکفار کی حرمت صراحۃً ثابت ہوتی ہے جبکہ ان کے شعائر اور مخصوص نشانات کے ساتھ تشبہ کیا جائے۔

مالکیہ مالکیہ اس میں بہت زیادہ آگے ہیں۔ انکے مسلک پر تشبہ اور مشابہت بالکفار کے علاوہ یہاں تک سخت گیری اور تحفظ ہے کہ عربی کے سوا عجمی زبانوں میں حلف اٹھانا ان کی سی دعائیں مانگنا ان کی زبان میں ذکر اللہ اور عبادت کرنا بھی ممنوعات میں سے ہے۔ حتی کہ بنقل حافظ ابن تیمیہ ان کے یہاں کفار کی عید دن اور میلوں وغیرہ کے ایام میں ایک بطیخ ذبح کرنا مسلمان کیلئے خنزیر ذبح کرنے کا مرادف ہے۔ مالکیوں کی مشہور کتاب "مختصر الخلیل" میں بنقل دمیاطی یہ تصریحات موجود ہیں۔

کفر المسلم بصریح کقولہ عزیر ابن اللہ او لفظ یقتضیہ کقولہ اللہ متحیز او فعل یتضمنہ

اگر مسلمان صراحۃً یہ کہدے کہ حضرت عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں یا کوئی لفظ ایسا بولے جو اللہ تعالیٰ کی

یکفر بلبس زنار ونحوه مما یختص بالکافر کلبس برنیطة نصرانی ۔

جیسے اور محدود ہو نیکا مقتضی ہو جیسے اللہ پاک خاص مکان میں ہو یا کوئی ایسا فعل کر گذرے جو اسلام کے خلاف کفر کی ممتاز علامت ہو ، جیسے زنار باندھ لینا یا نصرانی کی ٹوپی اوڑھ لینا تو وہ مسلمان کافر ہو گیا "

شوافع | حافظ ابن حجر قواطع الاسلام میں (بنقل دمیاطی) لکھتے ہیں کہ ۔

وحیث لبس زی الکفار سواء دخل دار الحرب ام لا بنیة الرضا بدینهم والمیل الیهم او تهاونا بالاسلام کفر ۔

اور جب کفار کا سا لباس پہن لیا (خواہ دار الحرب میں داخل ہوا یا نہ ہوا) ان کے دین سے راضی ہو کر یا ان کی طرف میلان خاطر کر کے یا اسلام کے ساتھ تہاون کر کے اسلام کو ہلکا سمجھکر ، تو وہ کافر ہو گیا ۔

حنفیہ | حنفیہ بھی اس مسئلہ میں بہت زیادہ متشدد ہیں ۔ شامی اور ہندیہ کی عبارت حسب ذیل ہے

یکفر بوضع قلنسوة المجوس علی راسه علی الصحیح ۔

مجوس کی ٹوپی سر پر رکھنے سے کافر ہو جائیگا قول صحیح کے اعتبار سے ۔

بہر حال مذاہب اربعہ تشبہ بالکفار کی حرمت و ممانعت کا اعلان کر رہے ہیں ہاں ان جزئیات پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر ایک شخص نے نصرانی یا مجوسی ٹوپی پہن لی یا زنار اپنے سینہ پر لٹکا لیا یا کفار کی عام وضع بھی اختیار کر لی تاہم جبکہ وہ توحید و رسالت کا صراحۃً منکر نہیں جنت و نار پھر اور معتقدات اسلامی اور ضروریات دین کا علی الاعلان انکار نہیں کرتا تو کوئی وجہ نہیں کہ محض اس ظاہری تغیر سے اسکے عام قلبی روش پر کفر کا حکم کر دیا جائے ۔ ؟ اس سوال کے جواب میں ہم حضرت قاضی بیضاوی کی وہ عبارت پیش کر دینا چاہتے ہیں جو انہوں نے سورہ بقرہ کی تفسیر کرتے ہوئے ایک موقع پر درج کی ہے ۔

واما نحو لبس الغیار وشد الزنار ونحوها کفرا لانها تدل علی التکذیب فان من صدق الرسول علیه السلام لا یجترئ

یہ جو غیار کے پہننے (زنار) یعنی جنیو اور انہی کی مانند دوسری حرکات کرنے کو کفر کہا گیا ہے سو محض اسلئے کہ یہ چیزیں اس شخص کی تکذیب کی علامت ہیں کیونکہ جو رسول علیہ السلام کی

علیہا ظاہرا الا کانہا کفر فی نفسہا۔ | تصدیق کی وہ بظاہر ان چیزوں کی جرأت نہیں کر سکتا۔ نیز کیا یہ چیزیں

اس سے واضح ہوگیا کہ حقیقتہً یہ اشیا یا یہ افعال کفر کے نہیں اسلئے اگر استہزا کرے تو جائز ہی مگر پھر بھی اس تشبہ کو اس لئے کفر کہا گیا ہی کہ کسی شخص کو علی الاعلان اور سر مخلوق ان چیزوں کے استعمال کی جرأت ہونا بلاشبہ اسکی دلیل ہے کہ اسکے قلب میں اسلامی اوضاع و اطوار کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں۔ بلکہ اسکے بالمقابل کفریہ اشیاء کی رغبت و محبت موجود ہے اور جبکہ ایک شخص کفر کے شعائر اور اسکی مخصوص علامات پر رغبت کے ساتھ اتر آیا تو کفر تک پہنچ جانا اس کیلئے حال ہی کیا رہ گیا۔ اسی لئے بعض حنفیہ نے صریح کفر کے اقوال پیش کئے ہیں اور بعض نے امارات کفر کے تاہم اگر تشبہ بالکفار کو امارات کفر سے بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی وہ ایک پوست ہے جس کا مغز کفر ہے جو اس میں مستور ہے۔

| صوفیاء | صوفیاء کرام مقربان بارگاہ الٰہی ہیں اور خواص حق میں سے ہیں۔ اسلئے وہ لوگ عام قانون شریعت کی تیسیرات و تسہیلات اور اس عام قانونی زندگی سے جو عوام و خواص پر یکساں جاری ہے، کچھ آگے ہیں۔ کیونکہ اُن کا دستور العمل خاص نبوۃ کی زندگی ہے۔ اور وہ حیات ابوذری کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

وہ تشبہ بالغیر کے بارے میں جسقدر بھی متشدد ہوں کم ہوں۔ اُن کے اصول پر تو شاید بہت سی وہ اوضاع و اطوار جو ٹھیک ٹھیک منہاج نبوۃ پر نہیں اُترتیں گو عام قواعد شریعت کے اقتضاء سے فی نفسہ شرعاً بھی نہوں عجب نہیں کہ منع تشبہ کے اصول سے رد کی جائیں۔ اور شاید کہ بہت سی وہ چیزیں کہ فتویٰ اپنی تسہیلات سے انکو حلال کہہ سکتا ہو اُن کا تقویٰ پھر بھی اسے ممنوع قرار دیگا۔ اسی لئے اُن کی تصریحات یہانتک تحفظ حدود کرتی ہیں کہ صرف عرب ہی کی زی و ہیئت میں ایک مسلمان کو محصور ہو جانا چاہیئے۔ کہ وہ ہی زی نبوۃ ہے۔ بقیہ عرب کے سوا تمام اوضاع و اطوار عجمی اشیاء ہیں جو قابل ترک ہیں۔ حضرت راس الاصفیاء ابو محمد شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

فیکرہ کلما خالف زی العرب وشابہ زی العجم (اقتضاء الصراط المستقیم)	اور مکروہ ہے جب بھی ہیئت عرب کی مخالفت پائی جائے اور ہیئت عجم کی مشابہت۔

پس ترک تشبہ کی تعلیم سب سے اول قرآن نے دی۔ پھر احادیث نے اسکی تفصیل کی پھر صحابہ نے اسکی تعمیل کی پھر علماء ظاہر (ائمہ اجتہاد وغیرہم) اور علمائے باطن (صوفیائے کرام) رحمہم اللہ نے اسکی علمی و عملی تائید کی۔ پھر وہ ایک نقلی یا محض استنادی چیز نہیں رہ گئی، بلکہ عقل سلیم نے اسکو بطوع و رغبت قبول کیا۔ تو اس اصول میں جو قرآناً حدیثاً، آثاراً، فقہاً، عرفاً اور خلاصہ یہ کہ عقلاً و نقلاً ثابت اور منضبط ہو چکا ہو۔ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم نے انتہائی اہتمام سے حدود اسلامیہ میں اس کا اجراء کیا ہو۔ اور امت اسلامی کا قدیماً و حدیثاً اسپر اجماع ہو چکا ہو۔ کیا اس صدی کے اسلامی افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں؟ اور کیا مسلمانوں کے لئے اسلام کے اس سچے اور پاک اسوہ میں کوئی حظ و نصیب نہیں؟ میں نہیں کہتا کہ نہیں! لیکن پھر مسلمان اپنے عمل سے اس کا جواب دیں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ اس اسوہ کی تائید میں کوئی علمی اقرار کریں اپنے عمل سے غیر اقوام کے سامنے اسکو مضبوط بنائیں کہ درحقیقت یہی ضبط و قوت اسلام کی قوت ہے۔ اور یہی ممکن ہے کہ اسلام کی ان تصریحات کے موافق ہر قسم کی موافقت اور مشابہت کفر کو مٹا دیں کیونکہ مخالفت کفر خود بالاستقلال اسلام کا ایک زبردست مقصد ہے۔ ہاں پھر بہت ہی زیادہ خصوصیت لئے ہوئے میرا روئے سخن اپنی ہم قوم جماعت طلبائے علوم اسلامیہ سے ہے کہ وہ خدا را اس صدا کو صدا بصحرا نہ سمجھیں۔ یہ حکمت حقیقۃً انہی کی گم کردہ متاع جان فروز ہے انہی کی استقامت پر عالم کی استقامت اور انہی کی زلت پر کائنات کی زلت۔ بہرحال متعلق ہی وہ عالم کے ستون ہیں اسلئے اگر وہ تھوڑی سی حرکت کرینگے تو قصر عالم مضطرب ہو کر بالکل در بہ انہدام ہو جائیگا۔ ۵

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا	
فلا تلوموا الاولاد فیہ علی الرقص	

اُن کا نیم جو ظلم مخلوق کے لیے ہزاروں فسوق و فجور کے لیے ایک دعوت و صلاء عام ہوگا ؎

چو نیم بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد
زنند لشکریانش ہزار مرغ بسیخ

فصل

کیا اسلام کی تمام تر بنیاد مخالفت کفر پر ہے؟

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کی تمام تر بنیاد اغیار کے خلاف ہی پر قائم ہے؟ کیا فی نفسہ اسلام کی کوئی مستقل اور قائم شدہ حقیقت نہیں؟ کیا اسکے وجود و ہستی کا خلاصہ یہی ہے کہ اغیار جو کچھ کریں تم ان کا خلاف کرو کہ یہی تمہارا اسلام ہے۔ مثلاً اگر مشرکین عرب ایک خاص طریقہ سے حج کرتے تھے تو کیا اسلامی حج صرف یہی ہے کہ ان کے خلاف ایک خاص ترمیم سے افعال حج جدا تجویز کر دیئے جائیں۔ اور ان سے اسلام کا وجود قائم کر دیا جائے؟ اگر اسلام کی حقیقت یہی ہے تو حقیقتاً اسلام ایک بے حقیقت چیز ہو جاتی ہے کیونکہ اصل وجود تمام مذاہب کے لئے ہو جاتا ہے اور اسلام کی تعمیر محض مذاہب کی ریزہ چینی اور ان کی قطع و برید پر قائم ہو جاتی ہے اور یہ کوئی حقیقی وجود نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال محض ایک مغالطہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں اسلام کی بنیاد کفر کے خلاف پر نہیں بلکہ کفر کی تعمیر اسلام کے خلاف پر قائم کی گئی ہے۔ اسلئے اسلام نے کسی ملت کا خلاف نہیں کیا بلکہ تمام ملتیں اسلام کے خلاف پر قائم کی گئی ہیں۔ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض ما لہا من قرار۔

عالم ازل میں جبکہ آدم و ابلیس کا مذہب ایک تھا کون تھا جس نے پہلے خلاف کی بنیاد قائم کی اور اسلام و استسلام کے بالمقابل انا خیر منہ کا علم استکبار و جحود بلند کیا۔ یقیناً وہ شیطان تھا نہ کہ آدم۔ کیونکہ آدم نے تو ربنا ظلمنا انفسنا کہکر اپنی عبدیت و بندگی اور اپنے اسلام حقیقی کا ثبوت پیش کیا تھا۔

پس ابلیس نے ہی سب سے پہلے اسلام و طاعت کے خلاف ایک مذہب بنایا جس کی اساس نفس

پرستی۔ کبر و رعونت اور داعیۂ انا خیر منہ تھی۔

اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ روز ازل ہی میں پہلے کفر کی بنیاد اسلام کے خلاف پر قائم ہوئی نہ کہ اسلام کی بنا خلاف کفر پر۔

پھر زمین پر اتر کر بھی آدم علیہ السلام تو اپنے اُسی عبدیت کیش اسلام پر قائم رہے جو آسمان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور ابلیس اسی کافرانہ خلاف پر جاری رہا۔ جو آسمانوں میں کر چکا تھا۔ پس عالم ازل کی طرح دنیا کی ابتداء آفرینش میں بھی محصل حقیقت اسلام ہی کے لئے رہی۔ اور خلاف یا قطع و برید صرف کفر کیلئے۔

پھر آدم کی اولاد میں بھی جب کفر کی بنا قائم ہوئی تو اسلام کے خلاف پر کیونکہ مذہب آدم کے خلاف قابیل ابن آدم کی ساتویں پشت میں پہلا انسانی کفر ظاہر ہوا۔ جس کے مقابلہ کیلئے نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے اور انہوں نے اس قوم کو یہ کہکر اپنی موافقت پر بلایا کہ میں مسلم ہوں

وامرت ان اکون من المسلمین ۔ میں اسپر مامور ہوں کہ میں مسلمین کیلئے ہوں۔

اگر یہ قوم اسلام آدم سے نہ پھری ہوتی اور اسلام کے خلاف اُسنے کوئی نیا مذہب نہ قائم کر لیا ہوتا۔ تو پھر اس کیلئے دعوت اسلام کی ضرورت ہی کیا رہتی؟

پس یہ ثابت ہوا کہ آدم کے بعد دنیا کے اس سب سے پہلے پیغمبر اور مبلغ اسلام کے دور میں بھی محصل حقیقۃ ... اسلام ہی کے لئے تھی۔ اور کفر کی حقیقت اسکے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ اسلام کے خلاف ... [illegible] ... کا مجموعہ تھا۔

پھر دور نوح ... سے بعد سے عہد ختم نبوۃ تک جوں جوں اہل کفر اسلام کے خلاف اپنے ... [illegible] ... کو قوموں میں شائع کرتے رہے ویں ویں اسلام ان کا مقابلہ کرتا رہا ... [illegible] ... جب کبھی کفر و طغیان اور اس خلاف کی تاریکی انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔ جب ہی حسب ضرورت دنیا میں نبوت کی روشنی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بھیجی جاتی تھی۔ لیکن ہر ایک نبی اسکا اقرار کرتا تھا کہ وہ مسلم ہے اور وہی اسلام لیکر دنیا میں آیا ہے جس سے ہٹکر اسکی قوم نے کفر

مذہب قائم کر لیا تھا۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی قوم نمرود کے مقابلہ پر یہی دعویٰ کیا کہ میں مسلم ہوں اور اسی قدیم اور اصلی مذہب پر قائم ہوں جو ہمیشہ آدم و نوح کا مذہب تھا، قرآن نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا۔

اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین۔

جبکہ ابراہیم سے ان کے رب نے فرمایا کہ اسلام لاؤ تو انہوں نے کہا کہ میں رب العلمین کیلئے اسلام لا چکا۔

بنا کعبہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے اسی اسلام پر پختہ رہنے کی دعا کی جس سے حضرت اسمٰعیلؑ کا اسلام ثابت ہوتا ہے۔

ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک۔

اے ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا مسلم اور ہماری اولاد کو اپنی امۃ مسلمہ فرمائیے۔

پھر حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو آخری وصیت ہی یہ کی تھی کہ تم اسلام پر مرتے دم تک جمے رہنا۔

ووصی بھا ابراھیم بنیہ ویعقوب یٰبنی ان اللہ اصطفیٰ لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون۔

اور اسی کا حکم کر گئے ہیں اپنے بیٹوں کو ابراہیم اور یعقوب بھی اے میرے بیٹو اللہ نے تمہارے لئے اس دین کو منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا

اور نبی یعقوبؑ نے اپنے مسلم ہونے کی کھلی شہادت یوں دی کہ۔

قالوا نعبد الٰھک والٰہ آبائک ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق الٰھا واحدا ونحن لہ مسلمون۔

انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسی کی پرستش کرینگے جسکی آپ اور آپکے بزرگ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کرتے آئے ہیں یعنی وہی معبود جو لاشریک ہے اور ہم اسی کے اسلام واطاعت پر رہیں گے۔

* یوسف علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ۔

اسلم لرب العالمین ۔	اللہ ہی کا راہ ہے ۔ اور ہمکو یہ حکم ہوا ہے کہ ہم پروردگار عالم کیلئے مسلم ہو جاویں

ایک جگہ حق تعالے نے عام منادی فرمادی کہ ۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللہِ الاسلام ۔	دین خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے ۔

اور فرمایا ۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ	اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو طلب کریگا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جاویگا

اور پھر حدیث نبوی نے اس گروہ طبقہ (انبیاء) کے وحدۃ دین کی اس آیت کے ماتحت یہ توضیح کی کہ تمام انبیاء اگرچہ صراحۃً کتنوں ہی کا قرآن نے ذکر بھی نہیں کیا ان سب کا دین ایک ہی اسلام رہا ہے ۔

نحن معاشر الانبیاء دیننا واحد والانبیاء اخوۃ العلات (او کما قال) ۔	ہم انبیاء کی جماعت ہمارا دین ایک ہے ۔ اور ہم بھی وحدۃ دین کے لحاظ سے ایسے ہیں جیسے علاتی بھائی کہ باپ سب کا ایک

اور اسی لئے قرآن کریم نے متعدد آیات میں بتلایا ہے کہ ایک نبی کی تکذیب تمام انبیاء کی تکذیب ہے کیونکہ سب کا دین اور صراط مستقیم ایک ہی تھا اور اسی لئے ہر ایک نبی نے اپنی تصدیق کیساتھ ساتھ اپنے ماقبل و مابعد انبیاء کی بھی تصدیق کی اور اپنی قوم سے کرائی ہے ۔

بہرحال آدم سے بلکہ عالم ازل سے لیکر عہد ختم نبوۃ تک اصولاً ایک ہی دین ہے جس کا نام اسلام ہے ، اُسکے پیرائے ، اُسکی قبائیں حسب عمر اور اسکی شرائع حسب اقوام بدلتی رہی ہیں لیکن سب میں ضو افشانی اسی ایک دین کی رہی ہے ایک ہی بحر بے پایاں ہے جس نے اپنا زلال حیات مختلف نہروں کے ذریعہ تقسیم کیا ہے اور ایک ہی پیکر رعنا ہے جو مختلف قبائیں پہنکر رونما ہوا ہے

بحریست متحرک باشکال مختلف	باران و قطرہ و صدف و گوہر آمدہ
مشتق چو یک ز دگری عین مصدر است	لیکن در صفات ظاہر خود مضمر آمدہ

اور اسلئے پچھلے ادیان حقہ (سماویہ) کو اسلام سے کوئی بھی اجنبیت نہیں ہے بلکہ ہر سچا مذہب اسلام ہی کا ایک مظہر تھا جہیں اسلام نے اپنی کسی خاص شان سے اپنی نمائش کی تھی ۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آن | ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

عربی کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کو دکھایا کہ کثرت میں وحدت کی تماثل ہو تو کثرت کو تعدد سے وحدت باطل نہیں ہو سکتی کس خوبی سے ادا کیا ہے

وما البحر الا الموج لا شئ غیرہ | وان فرقتہ کثرۃ المتعدد

اور اسلئے یہی دین سب سے پہلے عالم میں ظاہر ہوا۔ پس جسقدر بھی باطل مذاہب پیدا ہوئے وہ اس دین کے خلاف کرتے اور اس سے مقابلہ ٹھانتے میں نمودار ہوئے ہیں۔ اس لئے اسلام کی بنیاد عہد آدم سے عہد نبوی تک کسیطرح غیر مذاہب کے خلاف پر نہیں۔ بلکہ تمام مذاہب باطلہ کا سنگ بنیاد اسلام کے خلاف پر رکھا گیا۔ پس اگر اسلام غیر مذاہب سے تشبہ منقطع کرتا اور ان کی موافقت سے ہٹا کر صرف اپنی موافقت پر مجبور کرتا ہے۔ تو اسکے یہ معنی تو ہو سکتے ہیں کہ اسلام اپنے ہی خلاف سے روکتا ہے کہ اس کا وجود مستقل ہے اور اسکے سوا تمام مذاہب کا وجود محض خلافی اور غیر مستقل ہی ہے کہ وہ دوسروں کے خلاف سے اپنا وجود کسب کرتا اور دوسرے خرمن کا خوشہ چین ہے۔ نہیں بلکہ دنیا کے ہر خرمن خشک میں اگر کوئی پرمغز دانہ ہے تو اسی خرمن کا ہے۔ اگرچہ چوراپنی سارقانہ کارروائیوں کا اقرار نہ کریں۔

قمریاں باز غلط کردہ خودی دانند | ورنہ یک سرو دریں باغ بہ آزادی نیست

پس کس قدر حیرتناک ان لوگوں کا رویہ ہوگا جو اسلام کے مستقل شعبوں کو چھوڑ کر کفر کے بے جڑ اور مُزور شعبوں کو اپنا دستور العمل قرار دیں۔ اور شباہت نبوی کو ترک کر کے مشابہت شیاطین (من الجنۃ والناس) کو اختیار کریں۔ ایسوں ہی کی شکایت ان کے رب کی ہے۔

جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

ان اللہ اطہر انتقیاء حنفاء فی دوایت حنیفًا مسلمین فاجتالتہم جوانی ویطیعون الشیطان | اللہ تعالی نے میرے بندوں میں سے بعض کو حنیف پیدا کیا تھا پھر شیطان نے ان کو دین سے پھیر دیا اور وہ میری اطاعت کرتے ہیں

نظر دوست نادر کند سوئے تو | چو در روئے دشمن بود روئے تو

ندانی کہ کمتر نہد دوست پائے | چو بیند کہ دشمن بود در سرائے

فصل

تشبہ کے فقہی مراتب

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ منع تشبہ کا حقیقی مقصد ملتِ اسلامی کو التباس و تشابہ سے بچانا اور مسلم و غیر مسلم میں کلی انقطاع کر دینا ہے، یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ پھر بھی منع تشبہ کا منشا مخلوق کو تنگی اور حرج میں ڈالنا یا عام جبلی اور قدرتی جذبات کو پامال کر دینا نہیں۔ بلکہ وہ بہت سی باتوں کو باقی رکھتے ہوئے بعض مراتب کل میں اشتراک، بلکہ کتنے ہی قدرتی امور میں تشابہ کا بھی تحمل کر سکتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم تشبہ کے مراتب کا وہ تفصیلی نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے تشبہ کے جواز و عدم جواز، حرمت و کراہت، استحسان و عدم استحسان، اور امکان و عدم امکان کی تفصیلات پوری طرح پر واضح ہو جائیں گی۔

انسانی امور کی عقلاً دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اضطراری اور اختیاری۔ اضطراری امور وہ ہیں جن کے ایجاد و انعدام میں انسانی ارادہ کو کوئی دخل نہیں۔ مثلاً انسان کی تخلیقی وضع اور ظہور، اور جبلی اقتضاءات یعنی اس کے اعضاء، ہاتھ، پیر، چہرہ مہرہ، پھر اس کے ذاتی عوارض بھوک پیاس، نیند، اور اس طرح کے داعیے سے کھانے پینے پر مجبور ہونا، جنسی داعیہ یا اس جیسے فطری داعیے، اس کا قدرتی طور پر اپنے مخالف یا موافق کے لیے پیدا ہونا۔ اس کا اپنے رب کی معرفت و عبادت پر مجبور ہونا وغیرہ یقیناً اس کے اختیاری امور نہیں۔ اگر وہ نہ بھی چاہے تب بھی یہ جذبات اس کے دل پر ہجوم کرتے رہتے اور عمل کے دائرہ میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ اس وقت سے ان کا کو لیے ہوئے ہوتا ہے جبکہ اختیار و عدم اختیار کی حقیقت بھی اس کے دائرہ فہم میں نہیں ہوتی۔

اضطراری امور — ظاہر ہے کہ ایسے امور میں تصرف کرنے کے لیے شریعت اسے کوئی خطاب نہیں کر سکتی۔ یعنی یہ امور اگر مسلم و کافر میں مشترک ہیں تو منع تشبہ کے ذریعہ ان اشتراک کو

مٹانے کی کوئی سعی نہیں کی جائیگی۔ نہیں کہا جائیگا کہ اگر غیر مسلم کھاتے پیتے ہیں تو مسلم اُنکے خلاف ترک تشبہ کے ذریعہ بھوکا مرجائے۔ یا وہ ناک کان رکھتے ہیں تو یہ کاٹ ڈالے اور وہ اگر انسان ہیں تو یہ لایعقل جانور ہو جائے۔ کیونکہ مسلم وکافر کا یہ جبلی اشتراک یا عدم امتیاز جبکہ قدرتی ہے تو نہ انسان اُس کے مٹانے پر قادر ہی ہے اور نہ اس کے باقی رہنے میں جسلائے حدود یا تخریب حقائق کی کوئی مضرت ہی ہے۔ انسان کے بس ہی میں نہیں کہ وہ انسان نہ رہے بلکہ گدھا بنجائے یا حساس اور نامی نہ رہے بلکہ اینٹ پتھر ہو جائے۔ اور جبکہ انواع کی یہ قدرتی حدود اس درجہ منضبط یا اٹیاز اور حد معین و قدر معلوم پر ہیں کہ انسان کی کوئی ارادی حرکت نہ انھیں مٹا سکتی اور نہ اُن میں تلبیس کر سکتی ہے کہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔ تو پھر ترک تشبہ کے ذریعہ ایک ناممکن التباس کی روک تھام کرنے کی تکلیف دیا جانا بلاشبہ عبث اور خلاف حکمت امر ہوگا۔ جس سے خدا اور اُسکی پاک شریعت بری ہے۔

پس شریعت اسلامی اپنے اوامر و نواہی کے ذریعہ انسانی افعال کی تہذیب و شائستگی تو کریگی لیکن ان امور میں انسان کو کوئی خطاب نہیں کرے گی جو براہ راست خدا کے قوائے مدبرہ سے انصرام پاتے ہوں۔

وہ یہ حکم تو نہ دیگی کہ تم تشبہ بالغیر کے خوف سے کھانا پینا ترک کردو کہ غیر مسلم بھی ایسا کرتے ہیں کیونکہ یہ تمھارا اکتسابی عمل ہی کب ہے؟ لیکن یہ حکم ضرور دیگی کہ تم اپنے آداب خورد و نوش کو ترک تشبہ کے ذریعہ ممتاز بناؤ کہ طریق خورد و نوش ہر طرح تمھارا ہی اختیاری فعل ہے۔

وہ نہیں کہیگی کہ تم ترک تشبہ کے داعیہ سے لباس ہی ترک کردو کہ غیر مسلم لباس پہنتے ہیں کیونکہ تن پوشی تو انسانیت کا ایک غیر اختیاری شعار ہے۔ لیکن یہ ضرور کہیگی کہ تم لباس کی وضع و تراش کو غیر اقوام کے لباس سے ممتاز اور نمایاں رکھو کہ یہ ضرور تمھارے حدود اختیار میں ہے۔

شریعت کبھی نہیں کہیگی کہ تم غیر مسلموں کی ناک کان وغیرہ دیکھکر ترک تشبہ سے اپنی اعضا

بدن کاٹ ڈالو کہ یہ اعضا تمہارے اختیار و ایجاد سے کب موجود ہوئے۔ ہاں مگر یہ ضرور کہیگی کہ تمہارے
چہرے اور بدن کا تجمل غیر اقوام کی زینتوں سے نمایاں ہو کہ یہ تو سر تا سر تمہارا ہی اختیاری فعل ہے۔
شریعت ہرگز حکم نہیں کریگی کہ غیر مسلموں کو عبادۃ کرتے ہوئے دیکھکر تم عبادۃ ترک کر دو
کہ جذبۂ عبادۃ محض فطری داعیہ ہے۔ لیکن یہ حکم ضرور کرے گی کہ اپنی مکمل طرق عبادۃ کو غیر اقوام
کے ادھورے طرق سے ضرور ممتاز کر دو کہ یہ بلاشبہ تمہارا اختیاری فعل ہے۔

اسی طرح وہ خطاب نکرے گی کہ اگر غیر اقوام متمدن ہیں تو تم نفس تمدن ہی کا استیصال
کر دو کہ مدنی الطبع ہونا اور جانوروں کیطرح جنگلوں اور بھٹوں میں نہ گذار سکنا انسان کی ایک
غیر اختیاری خواہش ہے۔ ہاں مگر وہ یہ خطاب لامحالہ کریگی کہ تم اپنے تمدن کے اصول اور اسکے
رویتی دستور کو غیروں کے دساتیر سے ممتاز بنا دو کہ یہ تو بلاشبہ تمہارا ہی اختیاری عمل ہے۔

پس اب بعض سطح نظر انسانوں اور ان انسانوں کا جو بیکاری سے دلچسپی رکھنے کے
سبب عمل کے بجائے گویا شبہات ہی اٹھانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں) یہ کہنا بالکل
لچر اور حقیقت ناشناسی پر مبنی ہوگا کہ اگر تشبہ بالکفار حرام ہے تو ناک کان بھی کٹوا دو کہ کفار بھی ناک
کان رکھتے ہیں؛ سونا جاگنا وغیرہ بھی چھوڑ دو کہ وہ بھی سارے کام کرتے ہیں (گویا ترک تشبہ
ایک ناممکن العمل مسئلہ ہے) اور تشبہ و مشابہت فطرۃ کا تقاضا، کیونکہ میت کے سلسلہ میں شریعت
کو اختیاری اور تشریعی حیثیت سے امتیاز پیدا کرنا ہے نہ کہ تکوینی اور خلقی حیثیت سے اور انسانی
افعال کو التباس سے بچانا ہے نہ کہ خدا کے افعال کو۔ نیز ایسے دانشمندوں سے الزامی طور پر کہا
جائیگا کہ مسلم و کافر کی یہ اضطراری مشابہت اور صورت کی یکسانی سامنے رکھکر اختیاری امور
میں تشبہ و مشارکت کا فتویٰ دیدینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی عقل کا دشمن جماع زوجہ کے
حلال ہونے سے زنا کے جواز پر استدلال کرنے لگے کہ صورتاً و کیفاً زنا و جماع یکساں ہیں۔ پس
اگر یہ عقلمند جماع زوجہ کی مشابہت سے زنا کے حلال ہونے یا زنا کی مشابہت سے جماع زوجہ کے
حرام ہونے کا فتویٰ صادر کر دیں گے تو ممکن ہے کہ ان کے اس سوال پر بھی کوئی غور کیا جائے۔

طبعی اُمور | بہرحال مسئلہ تشبہ کا تعلق اضطراری اور تکوینی اُمور سے کچھ نہیں وہ تو دیگر مسائل شرعیہ کی طرح صرف اختیاری اُمور پر دائر ہے۔ لیکن اختیاری اُمور کی دو قسمیں ہیں طبعی اور تقیدی

طبعی افعال سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ اختیاری ہونے کے ساتھ ساتھ جبلت و خلقت کے کسی اندرونی داعیہ سے سرزد ہوں نہ کہ کسی بیرونی تعلیم اور سکھلانے یا بتلانے سے جیسے کھانا پینا وغیرہ کہ گو وہ انسان کا اختیاری فعل ہے مگر اس کا منشا (بھوک پیاس) غیر اختیاری ہے اسلئے یہ باوجود اختیاری ہونے کے بھی چونکہ طبعی ہے اسلئے گویا اضطراری ہے۔ پس اس میں بھی ہم ترک تشبہ کے مکلف نہ ہوں گے۔

تقیدی اُمور | تیسری اُمور وہ ہیں جو گو کسی دلی جذبہ کے ماتحت ظاہر ہوں مگر اُن کا ظہور زیادہ تر بیرونی آثار اور خارجی تعلیمات کا رہین منت ہو۔ اُن کی پھر دو قسمیں ہیں۔ تعبّدی اور تعوّدی یعنی وہ تعلیم کردہ اعمال یا عبادات اور دین کی قسم سے ہوں گے یا عادات اور معاشرت وغیرہ کی قسم سے صورت اولیٰ (مذہبی اُمور) میں تشبہ بالغیر حرام ہے۔ جیسا کہ نصاریٰ کی طرح سینہ پر صلیب لٹکا لینا۔

ہندوؤں کی طرح زنار باندھ لینا یا پیشانی پر قشقہ لگا لینا۔ اور سکھوں کی طرح ہاتھ میں لوہے کا کڑا پہن لینا۔ وغیرہ [illegible] شریعت [illegible] اختلاط و التباس کی بنا پر [illegible] ہیں۔

تشبہ بالذات اُمور | اور اگر تعوّدی یا معاشرتی اُمور ہوں [illegible] اُمور تشبہ بالذات ہوں گے یا مباح۔ اگر [illegible] مثلاً قوموں سے مخصوص لباس جیسے پتلون یا ہیٹ [illegible] یا کوئی ایسی [illegible] مخصوص ہو یا اس کی کوئی شان و عظمت ظاہر کی جاتی ہو وغیرہ کیونکہ تشبہ بالغیر کے علاوہ [illegible] وجہ ہیں کہ احسان فراموشی، تکلیف، تعظیم اصنام وغیرہ تو بالذات ممنوعات [illegible] ہیں۔

شعار اقوام اور اگر وہ امور مباح بالذات ہیں تو پھر دو صورتیں یا وہ امور کسی غیر قوم کا شعار اور امتیازی نشان ہوں گے یا ایسا نہ ہوگا۔ اگر شعار ہیں تو پھر بھی تشبہ قریب بہ حرام ہے جس کو فقہا نے اپنی اصطلاح میں مکروہ تحریمی سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً غیر اقوام کا وہ مخصوص لباس جو صرف انہی کی طرف منسوب اور انہی کی نسبت سے مشہور ہو اور انکے استعمال سے استعمال کرنے والا اسی قوم کا فرد سمجھا جانے لگے۔ جیسے نصرانیوں کی ٹوپی یا کسی قوم کا کلامی شعار یا رجز وغیرہ جسکی تفصیل اپنے موقعہ پر آجائیگی۔

ذی بدل اشیاء اور اگر غیر شعار ہیں تو پھر دو صورتیں یا وہ غیر شعار امور ایسے ہوں گے کہ جن کا بدل مسلمانوں کے یہاں موجود ہوگا یا نہیں؟ اگر ان کا بدل موجود ہے تو پھر ان امور میں بھی تشبہ مکروہ ہے کیونکہ اسلامی غیرت و حمیت کا اقتضا یہی ہے کہ ہم اقوام کی ان اشیاء کو ترک کریں جنکا بدل ہمارے پاس موجود ہے۔ ورنہ یہ ایک بے عزتی اور اپنے آپ کو خواہ مخواہ اغیار کا دستنگر بنا دینا ہے۔ جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دست مبارک میں عربی کمان لئے ہوئے تھے کہ آپ نے کسی کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو ناخوشی سے فرمایا کہ یہ کیا لئے ہوئے ہو؟ اسے پھینکدو اور عربی کمان رکھو کہ جس کے ذریعہ خدا نے تمہیں قوت و شوکت دی اور بلاد ارض کو فتح کرا دیا۔ چونکہ فارسی کمان کا بدل عربی کمان موجود تھی اسلئے غیرت دلا کر حضور نے روکدیا تاکہ غیر اقوام کے ساتھ ہر ممکن سے ممکن امتیاز پیدا ہو جائے اور چھوٹے سے چھوٹا اشتراک بھی منقطع ہو کر ایک مسلم اپنی ہی ہستی کے ساتھ نمایاں ہو۔ ورنہ اگر مسلم قوم اپنے گھر سے بے خبر ہو کر بلکہ اپنے گھر کو آگ لگا کر دوسروں کی عادات و معاشرت کا اتباع کرنے لگیں تو ان کی مثال ایسی ہی ہو جائیگی

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر ۔۔۔ تو همی جوئی لب نان در بدر
تا بزانو میان قعر آب ۔۔۔ وز عطش وز جوع گشتی خراب

ممنوع التشبہ امور ہاں اگر غیر اقوام کی اشیاء ایسی ہیں کہ ان کا کوئی بدل مسلمانوں کے پاس نہیں جیسے آج یورپ کی نئی نئی ایجادات۔ جدید اسلحہ تمدن و معاشرت کے نئے نئے سامان

تو اسکی پھر دو صورتیں ہیں یا اُن کا استعمال تشبّہ کی نیت سے کیا جائے یا بغیر نیت تشبّہ پہلی صورت میں استعمال جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ تشبّہ بالکفار کو نیتہً وارادۃً مقصود بنا لینا انکی طرف میلان و رغبت بغیر نہیں ہوسکتا اور کفار کیطرف میلان یقیناً اسلام کی چیز نہیں بلکہ اسلام سے نکال دینے والی چیز ہے۔

قرآن کریم نے تو صاف اعلان فرما دیا ہے۔ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔

نیز غیر مسلموں کی کورانہ تقلید کسی مسلم کو کبھی بام عروج پر نہیں پہنچا سکتی جیسا کہ خلاف کی تقلید فور کی جگہ میں مرض کی تقلید صحت میں اور کسی ضد کی تقلید دوسری ضد میں کوئی اضافہ و قوۃ نہیں پیدا کرسکتی۔ ہاں اگر ان چیزوں میں تشبّہ کی نیت نہ ہو بلکہ اتفاقی طور پر استعمال میں آرہی ہوں تو ضرورۃ کی حد تک انکے استعمال میں کوئی شرعی حرج نہیں۔

سدّ ذرائع اور احتیاط ہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام تفاوت اور فرق مراتب علم و اعتقاد کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ عملاً ہر درجہ تشبّہ کو ممنوع العمل قرار دے لینا ہی ایک مسلمان کے لئے احتیاط اور حقیقی پرہیزگاری کا باعث ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ہر تمدن و معاشرہ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اور اس سلسلہ کی ایک کڑی دوسری کو کھینچ لیتی ہے۔ پس کسی تمدن کی کسی چیز کو اختیار کر لینا گویا دوسری چیز کے لئے راستہ صاف کر دینا ہے تو اس طرح انجام کار پورے ہی تمدن کا حلقہ اپنے گردن میں ڈال لینا ہے۔ اسلئے بطور سدّ ذرائع تشبّہ کی ان تمام مراتب سے خواہ وہ حرام ہوں یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی عمل کے دائرہ میں یکساں ہی مخالفت کیجائے گی۔

کیونکہ شریعت کا یہ ایک خدا گانہ اصول ہے کہ وہ اُن اُمور سے بھی ایک مکلف کو الگ رکھتی ہے جو جواز و عدم جواز کے درمیان اشتباہ کا درجہ رکھتے ہوں کیونکہ وہ جسطرح حلال سے متصل ہیں اسیطرح حرام سے بھی متصل ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ ہر ایک انسان بجائے حلال کے اُن کے ذریعہ حرام میں مبتلا ہو جائے۔ چنانچہ بخاری کی ایک حدیث میں صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا گیا کہ۔

ومن وقع فی الشبہات کراع یرعیٰ حول الحمٰی	جو شخص شبہات میں پڑگیا وہ اس چرواہے کی مانند ہے

یوشک ان یواقعہ الا وان لکل ملک حمی الا وان حمی اللہ محارمہ۔

جو سلطانی چراگاہ کے قریب اور گرد و پیش ہی میں چرا رہا ہے قریب ہے کہ چراگاہ میں گھس جائیگا اور سلطانی عتاب کا مورد ہو جائیگا خبردار ہو ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہے سنو! اللہ کی چراگاہ اسکے محرمات ہیں۔ اور اسکا قریبی گرد و پیش مشتبہات ہیں پس مشتبہات میں پڑ جانیوالا ضرور ہے کہ محرمات کا ارتکاب کرنے لگے۔

پس حدیث نے تنبیہ کی کہ تم جائزات اور حلال امور پر قناعت کرو۔

نہیں بلکہ بعض اوقات امت کے ارباب تقویٰ و متدین احتیاطاً اور پرہیزگاری کے دائرہ میں بعض ایسے جائز امور کو بھی ترک کر دیتے ہیں جن کیلئے نہ کوئی صحیح ممانعت ہوتی ہے نہ ان کے کر لینے پر کوئی شرعی نکیر و ملامت۔ لیکن سو جہت کہ یا وہ امور ان کے فراست میں کسی نہ کسی شرعی کے بعید محتملات میں سے ہوتے ہیں یا بالکل جائز ہونے کے باوجود قوۃ قریبہ کے ساتھ کسی ناجائز حد تک پہونچا دینے کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔ جیسے حدیث میں فرمایا گیا۔

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔

جس شربت کے کثیر حصہ میں نشہ ہو اسکا قلیل حصہ بھی حرام ہے

حالانکہ اس قلیل میں سکر اور نشہ نہیں لیکن یہ قلیل ہی اس کثیر تک پہونچانے کا ذریعہ بن جاتا اس لئے حرام ہو گیا۔

یا حدیث میں فرمایا گیا۔

من اتی کاہنا فقد کفر بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

جو شخص کاہنوں کے پاس گیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قانون کے ساتھ کفر کیا۔

حالانکہ کاہن اور ساحر کی بتائی ہوئی چیزوں کو ماننا اور ان پر عقیدہ لانا تو کفر ہے لیکن محض اسکے پاس چلا جانا اور اس کے نزدیک سے گذر جانا کفر نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ آنا اور گذرنا ہی اسکی باتیں سننے اور پھر ان کو ماننے اور پھر ان پر عقیدہ لانے کا ذریعہ قریبہ تھا اسلئے اس سے بھی کفر کہکر روک دیا گیا

اسی لئے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں۔

ایاکم و محقرات الذنوب۔

چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہت بچو۔

کیونکہ یہ حقیر گناہ ہی عظیم گناہوں کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اسی لئے جہاں قرآن کریم نے فرمایا:
لا یزنون، (مومن زناکار نہیں ہوتے) اور زنا سے ممانعت کی وہیں یہ بھی فرمایا کہ۔

زنا کے قریب بھی مت ہو۔	لا تقربوا الزنا۔

یعنی دواعی زنا مثل لمس، تقبیل، یا شم یا لمحہ، یا قربت، یا خلوۃ سے بھی بچو کیونکہ یہی چیزیں زنا کے قریبی وسائل ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے حدود اللہ کی حفاظت کا حکم ان الفاظ میں دیا کہ۔

یہ اللہ کی حدود ہیں ان کے قریب بھی مت آؤ۔	تلک حدود اللہ فلا تقربوھا۔

یعنی گو قریب آنا فی نفسہ گناہ نہ تھا لیکن گناہ کا پیش خیمہ تھا اسلئے قربت بھی ممنوع ہو گئی۔
یہی وجہ ہے کہ جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنیکی ممانعت فرمائی تو صدیق اکبر رضی اللہ نے اپنے کوڑا اٹھا دینے کا بھی کسی سے سوال نہیں کیا جو گھوڑے سے گر پڑا تھا، بلکہ خود ہی اتر کر اٹھا لیا۔ حالانکہ فی نفسہ یہ سوال جائز تھا۔ مگر اس کا ہی سوال کے بعید محتملات لفظی میں سے ہونا بھی ممکن تھا، اسلئے احتیاطاً اس بعید امکان سے بھی رک گئے۔
یہی وجہ ہے کہ جب حق تعالے نے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اونچی آواز کرنے کی ممانعت فرمائی اور کہا۔

اے لوگو نبی کی آواز سے اپنی آوازوں کو اونچا مت کرو اور نبی سے اسطرح جہرت مت بولو جسطرح تم ایک دوسرے سے بلند آواز سے بولتے ہو۔	لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم بعضاً۔

تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جہوری الصوت اتنا آہستہ بولنے لگے تھے کہ ان کی بات برابر سنائی نہیں دیتی تھی۔ حالانکہ اتنی پست آوازی کا حکم نہ تھا لیکن تقوی کی احتیاط بہت سے جائز حصوں کو بھی چھوڑا دیتی ہے جبکہ ان جائزات سے ممنوعات کا راستہ صاف ہوتا ہو پس جسطرح ان مختلف انواع۔ رفع یدین بمسئلہ شکر۔ اتیان کاہن۔ قربت زنا۔ احتراز مسئلہ از۔ اقتراب حدود۔ رفع اصوات اور مسئلہ سوال کی کتنی ہی مشتبہ یا جائز حدود محض اسلئے ترک

بن کی گئیں تاکہ ممنوع حدود تک کسی کی رسائی ہی نہو سکے۔ اسیطرح مسئلہ تشبہ کے بارہ میں بھی شریعت کی نصوص اور عام قواعد شرعیہ اسیطرف راہنمائی کرتے ہیں کہ جس طرح اسکے ممنوع حدود سے احتراز کیا جائے اسی طرح اُنکی مشتبہ یا بعض جائز حدود سے بھی پوری قوت کے ساتھ عملاً احتراز کیا جائے تاکہ حد حرام و ممنوع تک نہ پہونچ سکیں وانہا لکبیرۃ الا علی الخٰشعین۔

ان چند فصلوں میں ہم نے مذاہب و اقوام کے اصلی صورت پر نہ رہنے اور انجام کار اونکے مٹ جانے کی اصولی اور کلی حقیقت کہ وہ تشبہ بالاغیار ہے پھر تشبہ کے تفصیلی مراتب کی نبتی کیفیت پیش کی۔ جسکو عقل و نقل اور محسوسات و طبیعیات سے باوجود کم مائگی اور بے بضاعتی کے میں نے اپنی بساط کی قدر واضح کرنے میں کوشش کی۔ اور الحمد للہ کہ عقل سلیم اور نقل صحیح سے اس موضوع کو جسقدر واضح کرنے کی ضرورت تھی وہ بالاجمال واضح ہو چکا اور ثابت ہو گیا کہ اصولاً تو شریعت کا تشبہ سے بحث کرنا کسی خود بینی یا تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ غیرت و حمیت اور تحفظ خود اختیاری پر اور اسپر کہ کوئی قوم اسوقت تک قوم نہیں کہلائی جا سکتی جبتک کہ اس کی خصوصیات پائندار اور مستقل نہوں۔ اور جبکہ اسلام کی امتیازی خصائص ہر حیثیت سے حق مستقل ناقابل تبدیل اور لازوال ہیں۔ تو سب سے زیادہ بلکہ صرف ایک اسلام ہی کو حق بھی ہے کہ وہ دنیا کی ساری قومیتوں کو مٹا کر اپنی برادری میں مدغم کر لے۔ اور اپنے ہی مخصوص رنگ سے ساری دنیا کو رنگ دے۔ یعنی قطع تشبہ کے اصول کو برملا استعمال کر کے غیر اقوام سے اپنی قوم کو بالکل ممتاز بنا لے۔ اگر اسلام اس مسلک تشبہ بالاغیار رد وہ تشبہ جس سے قومیتوں پر فنا طاری ہوتی ہے جس سے ابتداءً الحاد و زندقہ اور انتہاءً کفر صریح وجود پذیر ہوتا ہے) کے انسداد کے طریقے تعلیم نہ کرتا اور اس کی ریشہ دوانیوں کو نہ روکتا تو یہ اسکے چہرۂ تمام و کمال پر ایک نہایت ہی بدنما دھبہ ہوتا

لیکن اسلام جسطرح ہر نقص کے دھبہ سے پاک ہے اسیطرح اس عیب سے بھی پاک ہے۔ کہ اس میں مسئلہ تشبہ پر کوئی شافی بحث نہو۔

اسلام نے اپنی مکمل تعلیم کے صفحات میں تشبہ بالاقوام پر بھی کافی اور مکمل روشنی ڈالی ہے

اور انشاء اللہ ہم فروعی ابواب میں ..... ثابت کریں گے کہ اسلام کے تمام شعبوں (عادات و عبادات، حدود و کفارات، معاملات و سیاسیات، تمدابیر تمدن طرق تہذیب سبل اخلاق آداب معاشرات، اصول طعام و شراب، قوانین خواب بیداری، پھر تمام وہ کیفیات جو ایک انسان پر خلوۃ و جلوۃ، انفراد و اجتماع، نفسی و آفاقی، مادی و روحانی طور پر آسکتی ہیں) اسکے ہر ہر پہلو میں ترک تشبہ کی تعلیم موجود ہے۔ گویا اسلام کا مجموعی مرقعہ ہی ترک تشبہ کا ایک درس عبرت آموز ہے۔ مگر انہی توفیق شعار انسانوں کیلئے جو علم ازل میں اس عبرت سے مستفید ہونے کیلئے چھانٹ لئے گئے تھے۔ مسئلہ تشبہ کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب ہم آئندہ باب کی چند فصلوں میں اُن شبہات کا ازالہ کرینگے جو اس مسئلہ پر اب تک کئے گئے ہیں۔
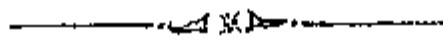
باب دوم

بحث و تنقید

حدیث من تشبہ بقوم فہو منہم

یہاں تک الحمدللہ مسئلہ کا ہر پہلو تحقیق کی روشنی میں آچکا ہے، اور مسئلہ تشبہ کی حقیقت۔ اسکی ضرورت اور شریعت کا اس کے بارہ میں انتہائی اہتمام کرنا سامنے لایا جا چکا ہے۔ ہاں ابھی تک یہ ضرورت باقی ہے کہ ہم ان نکتہ چینیوں اور شبہات و وساوس کی بھی مدافعت کریں جو سطحی النظر لوگوں کی طرف سے اس مسئلہ کو مخدوش بنانے کیلئے کئے گئے اور تا حال کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ پھر مسئلہ تشبہ بالکل بے غبار ہو جائے اور ایک جویائے عمل کیلئے شاہراہ عمل نمایاں ہو سکے۔

ان شبہات و خدشات کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ بعض کا اثر مسئلہ کے اعتقاد پر پڑتا ہے اور بعض کا عمل پر یعنی بعض شبہات کا حاصل سرے سے مسئلہ ہی کی تکذیب و تغلیط ہے اور بعض کا محصول عمل کی تعطیل۔ پھر اعتقادی خدشات میں بھی دو پہلو اختیار کئے گئے ہیں۔ بعض نے اس شرعی مسئلہ کی تکذیب میں خود شریعت ہی کو آلہ کار بنایا ہے اور گویا تردید مسئلہ کی منزل پر وہ لوگ تاویل کی راہ سے پہنچے ہیں تاکہ ان کو مکذب دین نہ کہا جا سکے۔ اور بعض عاقبت ناشناسوں نے اس منصوص مسئلہ کی تکذیب میں کسی بھی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ صرف اپنے اہواء و تخیلات ہی کو تردید کی کافی وجہ خیال کر کے شریعت کے بالمقابل خم ٹھوک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہم بحول اللہ و قوتہ ہر فریق کے استدلال پر بالترتیب پہلے بحث و تنقید کی نظر ڈالینگے اور پھر تحقیق کی۔ یعنی مناظرانہ اور الزامانہ جواب کے بعد اسکی حقیقت نمایاں کرینگے کہ اصل حقیقت کیا تھی؟ جس کو حقیقت ناشناسوں نے اپنی کج فہمی سے اس حد تک پہونچایا کہ وہ حقیقت کے بجائے ایک مغالطہ اور دھوکہ نظر آنے لگی

وباللہ التوفیق۔

فصل

پہلی قسم کے لوگوں نے (جو مجتہدانہ یا سُوداً نہ رنگ سے میدان خلاف میں آئے) قومی لکچروں۔ سیاسی خطبوں اور مطبوعہ تحریروں میں بہت ہی بلند بانگ ہوکر دعویٰ کیا کہ مسئلہ منع تشبہ ایک ناممکن العمل اور غیر معقول مسئلہ ہے۔

اور مسئلہ تشبہ کی صریح بنا حدیث من تشبہ بقوم فہو منہم پر تھی اسلئے اس حدیث کے رد و تضعیف میں اُنہوں نے اپنا سارا دماغی زور صرف کیا ہے۔

سر سید بانی کالج علیگڈھ جنکا اہم مقصد مسلمانوں کے دل و دماغ سے ان کے قدیم مخصوص اوضاع و شعائر کی اہمیت کا نکالنا تھا۔ اس طبقہ کے پیش رو ہیں۔ اُنہوں نے اس حدیث کو اپنے مقصد میں حائل دیکھکر اُسکو گرانے اور ساقط الاعتبار بنانے میں اپنے ایک موقت رسالے تہذیب الاخلاق کے کتنے ہی صفحات رنگے ہیں۔ اور اپنے زور قوت کے موافق مسئلہ منع تشبہ کا استیصال کر دیا ہے۔ اُنہوں نے حدیث مذکور پر چھ شبہات وارد کئے ہیں۔ پہلا شبہہ روایت اور سند کے اعتبار سے ہے۔ اور پانچ شبہے درایت اور تفقہ کے لحاظ سے ہیں۔ روایتی شبہات (یعنی ضعف رواۃ یا انقطاع) کے متعلق وہ تہذیب الاخلاق جلد چہارم بابت سنہ ۱۲۹۰ھ کے صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں کہ۔

"اول تو مجھکو یہ بیان کرنا چاہئے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ نہ روایۃً اور نہ درایۃً۔ روایۃً تو اسلئے ثابت نہیں کہ جو سند اس حدیث کی بیان ہوئی ہے اُس سے اتصال سند کا رسول خدا تک ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ جو لوگ خود روایت کرتے ہیں ان سے یہ بات لازم نہیں ہے کہ حسان اور ابی منیب کے درمیان میں اور کوئی راوی نہو۔ پس جبکہ سلسلہ روات غیر ثابت ہے تو وہ حدیث فی نفسہ ثابت نہیں۔"

اس مجہول شبہہ کے متعلق ہمیں کسی جوابی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا بہترین حل

اتفاق سے محدث شہیر حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں کر دیا ہے۔ اولاً حدیث مع سند حسب ذیل ہے۔

حدثنا عثمان بن ابی شیبۃ قال حدثنا ابو النضر یعنی ھاشم بن القاسم قال حدثنا عبد الرحمٰن بن ثابت قال حدثنا حسان بن عطیۃ عن ابی منیب الجرشی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم (رواہ ابو داؤد باب ماجاء فی الاقبیۃ)

پہلے راوی عثمان بن ابی شیبہ ہیں۔ دوسرے ابو النضر تیسرے ہاشم بن القاسم۔ چوتھے عبد الرحمٰن بن ثابت۔ پانچویں حسان بن عطیہ۔ چھٹے ابو منیب جرشی ہیں جنہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا کہ انہوں نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی قوم کیساتھ مشابہت اختیار کی وہ اسی قوم میں سے ہوگیا۔

حافظ ابن تیمیہ نے اسکے پانچوں رجال کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

ابن ابی شیبہ۔ ابو النضر حسان بن عطیہ۔ صحیحین کے ان مشاہیر اور اجلہ رواۃ میں سے ہیں کہ ان کی ثقہ و عدالت ہرگز اس قول کی محتاج نہیں کہ وہ صحیحین کے رجال میں سے ہیں" بلکہ صحیحین کے رجال کی جماعت اسلئے ایک سنہری لڑی ہو کہ ان جیسے ثقہ حضرات اس زنجیر کی کڑیاں ہیں۔

عبد الرحمٰن بن ثابت اُن رواۃ میں سے ہیں کہ یحییٰ بن معین ابو زرعہ اور احمد بن عبد اللہ جیسے ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ لیس بہ بأس (انکے بارہ میں کوئی جرح و طعن نہیں ہے) اور عبد الرحمٰن بن ابراہیم نے فرمایا کہ ھو ثقۃ ابو حاتم جیسے امام نے فرمایا کہ ھو مستقیم الحدیث۔

ابو منیب جرشی بھی ان صدوق رواۃ میں سے ہیں جنکے متعلق احمد بن عبد اللہ العجلی فرماتے ہیں کہ ھو ثقۃ (وہ ثقہ ہیں) میں نہیں جانتا کہ کسی نے برائی سے اُن کا ذکر کیا ہو۔ اس بیان سے سید موصوف کی تضعیف رواۃ جو ہنوز پردۂ خفا میں ہے ہباءً منثورا ہو جاتی ہے۔

سید صاحب فرماتے ہیں کہ "کیونکہ جو الفاظ روایت کئے ہیں اُن سے یہ بات لازم نہیں ہوتی

کہ حسان اور ابی منیب کے درمیان میں اور کوئی راوی ہو " لیکن اول تو بلا سلسلہ سند پر الفاظ حدیث سے جرح کرنا ہی جرح و تعدیل کا ریک انوکھا اصول ہے ۔ اور پھر وہ دعویٰ انقطاع مذکور مان ہی تو نہیں کہ کیوں یہ بات لازم نہیں آتی "۔

پس یہ بات مان لو کیا ہوتی کہ حسان اور ابی منیب کے درمیان میں انقطاع ہے اور سماع ثابت نہیں اور اسکی مجہول بھی رہ گئی اسلئے جواب دہی کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن تبرعاً اس انقطاع کا جواب یہ ہے جو ابن تیمیہ نے دیا ہو کہ ۔

وقد سمع منه حسان بن عطية وقد احتج الامام احمد وغيره بهذا الحديث ۔

حسان بن عطیہ کا ابی منیب سے سماع ثابت ہے اور امام احمد وغیرہ نے اس حدیث کو حجت سمجھا اور اس سے احتجاج کیا ہے (اقتضاء الصراط المستقیم ص۳۹) ۔

پس ابن تیمیہ کے اثبات سماع کے مقابلہ میں سید صاحب کی نفی سماع کیا وقعت رکھ سکتی ہے اور امام احمد کے احتجاج کے مقابلہ میں ان کا حدیث کو حجت نہ ماننا ہمارے نزدیک کیا اہمیت رکھتا ہے۔

پھر نہ صرف اسی ایک سند اور ایک کتاب پر اس حدیث کا مدار ہے ۔ بلکہ طبرانی نے اپنے معجم کبیر اور اوسط میں عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اور بزار نے اپنے مسند میں حذیفہ و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے پھر ابو نعیم نے تاریخ اصبہان میں انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور قضاعی نے طاؤس سے مرسلاً بھی روایت کیا ہو (شرح جامع صغیر) اور ابن قیم کہتے ہیں کہ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو ابن عمر سے روایت کیا ہو ۔ (زاد المعاد ص۳۶ جلد ۱)

پس اگر کسی ایک سند میں ضعف بھی تسلیم کر لیا جائے تو کثرۃ طرق کی قوۃ حسب اصول حدیث اس ضعف کا کافی تدارک ہو ۔ اسلئے کسی کا منہ نہیں ہے کہ محض خلاف اغراض ہونے کی وجہ سے اس حدیث کی تضعیف کے درپے ہو ۔ اور کسی کلام نبوۃ کو اپنی رائے پر قربان کرے ۔ [illegible]

فصل

درایتی شبہات

(پہلا شبہ)

سرسید تہذیب الاخلاق جلد چہارم کے صفحہ ۴۰ پر لکھتے ہیں کہ: "راوی نے مورد حدیث بیان نہیں کیا اور لفظ تشبیہ کا جو حدیث میں واقع ہے مورد حدیث کے نہ معلوم ہونے سے کسی حکم مدلولی یا استنباطی یا قیاسی کا فائدہ نہیں دیتا ہے"۔

اول تو یہی غلط ہے کہ حدیث کا مورد متعین نہیں ہے۔ جبکہ تمام صحابہ مختلف مواقع دینی دنیا میں اس حدیث سے احتجاج کر رہے ہیں (جیسا کہ ہم پہلے باب میں اس حدیث کے ماتحت پیش کر چکے ہیں اور آئندہ دوسرے حصص میں جزئیات کا ذخیرہ انشاءاللہ پیش کرینگے)۔ تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مورد متعین نہیں۔ جن جن مواقع میں اسکو استعمال کیا گیا، کم از کم وہ مواقع تو مورد بننے کی صلاحیت ضرور ہی رکھتے ہیں۔ لیکن اگر بالفرض مورد متعین نہیں بھی ہے تو نہو، کہ حدیث کے کلمات تالیفیہ خود با معنی اور موضوع ہیں نہ کہ مہمل و بے معنی۔

پس عام قواعد شریعت کے دائرہ میں رہکر اسکے لغوی مدلول سے ہی حدیث کی مراد متعین کیجا سکتی ہے بلکہ اصول فقہ کے قواعد نے تو یہاں تک واضح کر دیا ہے کہ اگر مورد متعین بھی ہو تب بھی اس کا اعتبار نہیں، اعتبار صرف عموم کلمات کا کیا جاتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا۔ العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المورد۔ اس لئے یہ سوال ہی مہمل اور بے معنی ہے۔

دوسرا شبہ

پھر سید صاحب تہذیب الاخلاق کے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ۔ "دوسرے یہ کہ لفظ تو مم جو اس

حدیث میں ہے وہ بھی کسی نتیجہ کا فائدہ نہیں دیتا۔ کسی قوم کا ہونا یا کسی قوم کے مشابہ بننا کسی نتیجۂ شرعی کو مفید نہیں ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان نے عربی یا ایرانی یا پٹھانی یا روسی یا انگریزی پوشاک پہنکر اپنے تئیں مشابہ اُن قوموں کے بنایا اور لوگوں نے بھی اُسکو اُسی قوم کا سمجھا تو پھر اُس سے نتیجۂ شرعی کیا نکلا؟؟

(جواب)

نتیجۂ شرعی ایک نہیں بلکہ متعدد نکلتے ہیں۔

محو امتیاز | ایک جبکہ یہ نتیجہ نکلا کہ اقوام کفر و اسلام میں کوئی ظاہری امتیاز نہ رہا۔ حالانکہ شریعت کا مقصود اقوام میں باہمی امتیاز پیدا کرنا ہے۔ جیساکہ وہ اقوام میں نہ کہ تلبیس و التباس، چنانچہ آیات و احادیث اور فرامین خلفاء راشدین وغیرہ سے اس مقصود پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ تشبہ کے بعد شریعت کا یہ معقول مقصد (امتیاز اقوام) فوت ہو جاتا ہے۔

تقویۂ حجت کفار | امتیاز مٹ کر جبکہ صورتاً التباس و اشتراک پیدا ہوگا۔ تو اس ظاہری اشتراک عمل ہی سے کفار کو مسلمانوں پر ایک حجت ہاتھ آجائیگی، جس کو بطور نظیر قائم کرکے وہ اور دوسرے امور میں بھی ایسے ہی اختلاط و التباس کی طمع رکھ سکیں گے۔ حالانکہ ان کی ظاہری حجت تک کو بھی قطع کر دینا اسلام کا ایک اہم مقصد ہے۔ جیساکہ نسخ قبلہ سے اسی ظاہری مشارکت عبادۃ یا صوری یک رخی و یک جہتی کو مٹایا گیا لئلا یکون للناس علیکم حجۃ۔

استخفاف و تحقیر شریعت | شریعت اسلام نے اصولی طور پر لباس کی سادگی و بذاذۃ کے متعلق جو حدود قائم کی ہیں اور ان سے جن روحانی منافع کو ملحوظ رکھا گیا ہے (جیساکہ بعد لباس کی فصل میں بالتفصیل ظاہر کریں گے) تشبہ بالغیر سے ان کا استخفاف و استہزاء لازم آتا ہے۔ جو بعینہٖ توہین شریعت ہے۔ اور ایک تشبہ کا عمل ہی بعد چندے استخفاف و استہزاء دین کا خاص شعار ہے۔ چنانچہ انگریزی معاشرت کے دلدادہ یا متشبہین از خیبت کسی اسلامی تقشف و سادگی کو خواہ وہ لباسی ہو یا عام معاشرتی کبھی وقعت و احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ تحقیر کی آنکھ سے معائنہ کرتے ہیں۔ اور حالت اسلام میں ایسی توہین اسلام یقیناً نفاق کا

مشابہ ہے۔

میلان بہ اغیار پھر کسی غیر سے مشابہت پیدا کرنے کا داعیہ بغیر اسکی طرف میلان و رغبت کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ میلان خود ہی ایک ممنوع شرعی ہے ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ پس جس چیز کے مقدمات ممنوع شرعی ہوں کیا اس کے اصل نتیجہ کو شریعت کے جائزات میں سے کہا جا سکتا ہے؟

ابقاء تمایز سلف نیز سلف صالحین کا ہر قرن میں منع تشبہ پر زور دینا اور لباس کو خصوصیت کے ساتھ تشبہ سے بچانے کی کوشش کرنا سب لغو ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا دفار باندی کے بدن سے حرائر کا لباس اتروا دینا اور ڈانٹ کر کہنا اتتشبہین بالحرائر؟ پھر عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیز کا، نصاریٰ بنی تغلب کے وفد سے عربی لباس اتروا دینا اور اسکو قطع کر کے مسلمانوں کے لباس سے ممتاز کر دینا۔ امام ابو یوسف کا اپنے زمانۂ قضاء و حکمرانی میں علماء و فقہاء کیلئے ایک ممتاز لباس تجویز کرنا تاکہ فقیہ و غیر فقیہ نمایاں رہیں۔ محدث شہیر امام ابو داؤد سجستانی کے ایک استاد کا امیر وقت کو باریک کپڑے پہنے ہوئے دیکھکر کہ اٹھنا کہ امیرنا یلبس ثیاب الفساق اور پھر قرون مابعد میں عموماً فقہاء و ائمہ کا ایسی جزئیات پر تشدد کے ساتھ روک ٹوک کرنا سب ہی لغو اور باطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ تعامل سلف خود ایک مستقل دلیل کا درجہ رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ مالک امام دار الہجرۃ تعارض احادیث کے وقت محض تعامل اہل مدینہ ہی کو زبردست مرجح قرار دیتے ہیں۔

شہادۃ سیئہ ایک مسلمان کو کافرانہ صورت میں دیکھکر عام گمان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اسلامی فرد نہیں۔ یا اگر ہے تو اسکے دل میں عام اوضاع مسلمین کی کوئی عظمت نہیں جو نفاق کی دلیل ہے پس مسلمانوں کا کسی کے حق میں کافر یا منافق ہونے کا گمان رکھنا یا اسکے غیر مسلم اور منافق ہونے کی شہادت دینا کیا عند اللہ کوئی اثر نہیں رکھتا۔ حالانکہ انتم شہداء اللہ فی الارض۔

اجراء احکام کفر پھر قطع نظر خصوصی معاملات کے کہ جب ایسے متشبہ کو غیر مسلم جماعت کا فرد تصور کیا جائے گا تو کیا یہ ممکن ہے کہ اسکی موت کے وقت جبکہ وہ کسی اجنبی جگہ فوت ہوا احکام

دنیا میں کوئی اسلامی ضابطہ اسپر جاری کیا جائے؟ اسکے جنازہ کی نماز پڑھی جائے۔ یا مسلمانوں کے مقبرہ میں دفن کیا جائے۔ یا عام تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ پر عمل میں آئے؟ ہرگز نہیں اور یہ ایک عظیم الشان محرومی ہے۔

پس اگر بقول سید صاحب کے تشبہ کو صرف لباس ہی میں منحصر مان لیا جائے تو کیا اس لباسی تشبہ سے کوئی شرعی نتیجہ پیدا نہیں ہوتا؟ کیا امتیاز اقوام کا مٹ جانا، کفار کے ہاتھ میں مسلمانوں کے خلاف کسی حجۃ کا ہاتھ آجانا۔ عام اوضاع مسلمین کا استخفاف و استہزاء قلوب میں جاگزیں ہو جانا۔ اسلامی قلوب میں کفار کیطرف رکون و میلان کا پیدا ہو جانا۔ تعامل سلف کا باطل ٹھیرایا جانا۔ مسلمانوں کا کسی کے حق میں بُری شہادۃ دینا۔ احکام دنیا میں کسی پر اسلامی احکام کا جاری نہ کیا جانا۔ کیا یہ سب شرعی اُمور نہیں ہیں جنکے متعلق خود شریعت نے اپنی نصوص میں اثباتاً و نفیاً بحث کی ہے۔

اور جبکہ تشبہ بالکفار اپنے ساتھ یہ تمام ممنوعات لیکر آتا ہے تو کیا تشبہ بالاقوام سے کوئی بھی شرعی نتیجہ نہ نکلا؟ حالانکہ یہ تمام شرعی نتائج ہیں جو اس سے پیدا ہوئے اور اس سے جیسے تشبہ بنفسہٖ ممنوع ثابت ہوا تھا، اب اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی ممنوع بن گیا۔

تیسرا شبہہ

سید صاحب تہذیب الاخلاق کے صفحہ ۱۰ پر لکھتے ہیں جس کا ماحصل ملاحظہ ہو۔ "جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جُبّہ رومیہ ضیقۃ الکمین جو عیسائیوں کا لباس تھا پہنا۔ نیز حضور نے جبۂ شامیہ جو یہود کا لباس تھا پہنا۔ نیز حضور نے جبہ طیالسیہ جو آتش پرستوں اور مجوس کا لباس تھا پہنا۔ اگر تشبہ ممنوع تھا تو حضور نے کیوں ایسے اُمور کا ارتکاب فرمایا نیز صحیح بخاری میں ہے۔

کتاب اللباس باب قول اللہ قل من

(کتاب اللباس۔ باب بیان میں قول اللہ تعالیٰ کے کہ فرما دیجئے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کی ہوئی زینت کو کس نے

حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلوا واشربوا والبسوا ما طاب لکم الخ	اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہو اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہو؟ اور فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کھاؤ پیو پہنو (جیسی جو تمھیں بھائے) ۔

پس یہ آیۃ وحدیث تشبہ کے مسئلہ کو باطل ٹھیرا رہی ہے۔ (جواب) میں کہتا ہوں کہ۔
تشبہ کے کلی اور اصولی مسئلہ کے خلاف بہت تجسس وتلاش کے بعد یہ تین چھوٹی جزئیات پیش کی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بالفرض چند جزئیات کلیہ کے معارض بھی ہوں تو کیا ان چند جزئی واقعات کی خاطر کلیہ کو باطل کر دینا چاہیے یا کلیہ کو اصل رکھکر ان مستثنیات کا کوئی ایسا محل بیان کر دینا چاہیے کہ کلیہ پر بھی زد نہ پڑے اور متعارض جزئیات بھی برمحل باقی رہجائیں ہمارے نزدیک عقلاً اور شرعاً دوسری صورت ہی قابل عمل ہو سکتی ہی کیونکہ کلیہ اور ضابطہ اصولی اسباب اور کلی علل وحکم پر مبنی ہوتا ہی اور جزئی واقعات اس قسم کے کلی علل واسرار سے ساکت ہوتے ہیں پس ناطق کو اصل رکھکر ساکت کو اس کا تابع بنانا ہی اصولی اور عقلی فعل قرار پا سکتا ہی۔ پس ان تینوں جزئیات کو اصول حدیث کے مطابق بے تکلف کہا جا سکتا ہی۔ کہ واقعۂ حال کا عموم نہیں۔ یعنی ان وقائع میں کوئی ایسی عام علۃ یا سبب یا وجہ نہیں کہ کلیہ تشبہ کے توڑنے میں اس سے مدد لیجا سکے۔ نیز ہمیں ابتک ان جزئیات میں کوئی لفظ بھی ایسا محسوس نہیں ہوا جو ان ہر سہ جبوں کے استعمال سے تشبہ کے جواز کا نتیجہ پیدا کرتا ہو کیونکہ تشبہ مشتبہ سے ماخوذ ہے اور مشتبہ کے معنی ہیں دو چیزوں کا آپس میں ایسا ملتبس ہو جانا کہ کوئی بھی اپنے اصلی وجود کو نمایاں نہ رکھ سکے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا شبہ ایک انسان کو دوسرے کیساتھ اسیوقت ہو سکتا ہے جبکہ پہلا دوسرے کے مخصوصات اور امتیازی نشانات کو اختیار کرلے۔ اور صورۃ اس میں نہ ملجائے اور یہاں اسکی کوئی دلیل نہیں کہ جبہ رومیہ عیسائیوں کا اور جبہ شامیہ یہود کا اور جبہ طیالسیہ مجوسیوں کا کوئی مخصوص لباس تھا۔ تاآنکہ مشتبہ اور تشبہ پر کوئی استدلال کیا جا سکے؟ بلکہ محض رومی، شامی اور طیالسی کی نسبت سے تو یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ یہ جبے

ان کے استعمال میں بھی آتے ہوں چہ جائیکہ ان کا مخصوص شعار ہوں۔

کیونکہ مصنوعات کی نسبتیں کبھی تو موجد اور صانع کی طرف کیجاتی ہیں اور اسی نسبت کی وہ شے موسوم اور مشہور ہو جاتی ہے جیسے ڈاسن کا بوٹ اور پیرس سوپ (پیرس کا صابون) پس اگر کہا جائے کہ ہندوستانی پیرس سوپ اور ڈاسنس بوٹ استعمال کرتے ہیں تو محض اس نسبت سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ہندوستانی ڈاسن اور پیرس سے تشبہ کر رہے ہیں۔ بلکہ اس نسبت سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ڈاسن اور پیرس خود اس بوٹ اور صابون کو استعمال کرتے ہوں چہ جائیکہ یہ ان کا کوئی امتیازی نشان ہو۔ ہاں صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بوٹ اور صابون انکی دوکان کا یا ان کا مصنوع ہے جسے ہندوستانی استعمال کرنے لگے ہیں۔

اسی طرح کبھی مصنوعات کی نسبتیں جائے صنعت اور خاص خاص شہروں یا ملکوں کیطرف ہوتی ہیں اور وہ اسی نسبت سے دنیا میں مشہور ہو جاتی ہیں، جیسے کپڑوں میں اٹالین یا بنارسی کہ اٹالین اٹلی کی ساخت ہونے کی وجہ سے اسی ملک کیطرف منسوب ہے۔ اور بنارسی بنارس کیطرف منسوب ہے کہ وہیں کی صنعت ہے۔

پس اگر کہا جائے کہ فلاں شخص بنارسی اور اٹالین استعمال کرتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ کپڑے اٹالیوں اور بنارسیوں کے مخصوص شعائر ہیں اور وہ شخص یہ کپڑے استعمال کر کے ان لوگوں کے ساتھ تشبہ کر رہا ہوتا ہے ہرگز نہیں۔ شعار اور تشبہ کیا معنی ان نسبتوں سے تو یہ سمجھا جانا بھی ضروری نہیں کہ یہ مصنوعات وہاں سرے سے استعمال بھی کیجاتی ہوں بلکہ ممکن ہے کہ تجارت کے سلسلہ میں محض دوسرے ملک کیلئے بنائی جاتی ہوں۔ جیسے اکثر رنگین اور شوخ [illegible] تیار [illegible] جاتے ہیں [illegible] ان سے قطعی اجتناب کرتے ہیں پس کپڑوں کی یہ نسبتیں محض صنعت یا [illegible] کے اعتبار سے مشہور ہوتی ہیں جنکو تشبہ سے کوئی علاقہ نہیں۔

اسیطرح جبکہ [illegible] روایت میں آیا کہ حضور نے رومی۔ شامی اور فارسی جبہ استعمال فرمایا تو محض

اس نسبت سے یہ کیسے مفہوم ہو گیا کہ وہ جُبّے ان ممالک کے باشندوں کے مخصوص شعار اور خاص لباس تھے اور حضورؐ نے انہیں بطور تشبّہ کا بیان جواز فرما دیا۔ شعار تو کیا یہ نسبتیں تو نفسِ صنعت پر بھی دلالت نہیں رکھتیں۔ پس ان نسبتوں سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ یہ جُبّے ان ممالک کے تھے وہاں کے مصنوع تھے یا وہاں بکتے تھے اور وہیں سے دوسرے ممالک میں منتشر ہوتے تھے۔ اور حضورؐ نے بھی ایک غیر ملکی صنعت کا اتفاقاً استعمال فرما لیا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بُرد یمانی استعمال فرماتے تھے تو کیا اس نسبت سے یہ بھی لازم آنا ضروری ہے کہ یہ چادر وہاں کے لوگوں کا خاص شعار ہے اور آپ یمنیوں کے ساتھ تشبّہ بھی سمجھے جائیں؟ ہرگز نہیں۔ یا حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شام و مصر کی آئی ہوئی قباطی استعمال فرماتے تھے (قباطی اس کتانی چادر کو کہتے ہیں جسکو قبطی بنتے تھے یہ نسبت بنانے والوں کی طرف ہے) تو کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ حضورؐ قبطیوں کے ساتھ تشبّہ کرتے تھے؟ معاذ اللہ۔

حالانکہ محض اس نسبت سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ قبطی اس چادر کو سرے سے استعمال بھی کرتے ہوں چہ جائیکہ یہ چادر ان کا مخصوص شعار بنکر تشبّہ کا دروازہ کھولتی ہو؟ پس ایسی مبہم نسبتوں سے منعِ تشبّہ کے مبیّن اور واضح اصول کو توڑنا یا جوازِ تشبّہ پر استدلال کرنا ایک نہایت ہی بے معنی استدلال ہے بلکہ بجائے خود ایک خلافِ دلیل مدعی ہوگا جس کی توقع کم از کم کسی اہلِ علم سے نہیں کیجا سکتی۔

بہرحال کسی کلیۂ حدیث اور قولی دستورالعمل کے مقابلہ میں اگر اس قسم کی عملی جزئیات ظاہر نظر میں معارض بنکر سامنے آجائیں اور احتمال کہ ان جزوی واقعات کی کوئی واضح علت نظر آتی ہو نہ ہو بہر سبب تو ان جزئی امور کے سبب اس کلیہ میں کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے واضح اسباب بھی موجود ہیں اور بیّن علل بھی۔

بلکہ کسی کلیہ اور ضابطہ کے مقابلہ میں کسی جزئی کا حکم معارض ثابت ہو جانا تو [illegible]

میں تاویل کرنے کیلئے کافی ہے اگرچہ لغۃً رفع تعارض کی کوئی وجہ بھی نمایاں نہ ہو۔ صحیح مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دن حضورؐ نے زعفران سے رنگے ہوئے سرخ کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا۔

ان ھذہ من لباس الکفار فلا تلبسھما!	یہ سرخ کپڑے کفار کے کپڑے ہیں۔ انہیں مت پہنو۔

اور نہ صرف زعفرانی سرخی ہی بلکہ عموماً سرخ کپڑوں سے ممانعت احادیث کے صریح الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ اور ادھر صحیح حدیث میں امر کلی اور قولی ضابطہ کے خلاف یہ عملی جزئیہ بھی موجود ہے۔ کہ

رأیتہ فی حلۃ حمراء	حضورؐ پر سرخ ازار و چادر دیکھی گئی!

لیکن ابن قیم رحمہ اللہ صاحب زاد المعاد نے بھی کہا ہے کہ جبکہ ممانعت حمرۃ کے صریح اقوال موجود ہیں تو کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے دوسروں کو ممانعت فرما کر خود ہی جسم پاک پر استعمال فرمایا ہو؟ ہرگز نہیں۔ پس کہا جائیگا کہ اس سرخ حلہ سے سرخ دھاری کا حلہ مراد ہے کیونکہ یہ ازار یمنی چادروں کا تھا۔ اور یمنی چادروں کی عام روش یہی تھی کہ وہ سرخ اور سیاہ دھاری کی بنی جاتی تھیں۔ مگر لوگوں کو حلہ حمراء کے لفظ سے اس کے سرخ ہونے کا دھوکہ لگ گیا۔

بہر حال یہ جزئیات اس درجہ کی نہیں ہیں کہ سید صاحب کو ان کے اس مقصد اتصال سے مسئلہ تشبہ میں کامیاب بنا سکیں۔ رہا آیۂ کریمہ قل من حرم زینۃ اللہ اور حدیث نبوی کلوا واشربوا والبسوا کے عموم سے جواز تشبہ پر استدلال کرنا اور سید پر بخاری کی اس تفسیر الی ما طاب لکم (جو تمہیں بھائے اور پسند ہو) جواز کی تعمیم سے تشبہ میں، سو یہ پہلے استدلال کی بھی زیادہ واہی ہے۔

کیا اس عموم کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ کھانے پینے میں ہمارے لئے شراب و خنزیر بھی حلال ہے۔ اور پہننے میں ریشم بھی جائز ہے؟ اگر یہ عموم اسلئے نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرے

ہوا قع پر ان چیزوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ زینت کے تمام ان شقوں کو جو تشبہ پر مشتمل ہیں دوسری دلائل ممنوع قرار دے رہی ہیں۔ وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہو کر حلال نہیں بن سکتیں کوئی وجہ نہیں کہ باب اکل و شرب میں تو دوسری دلائل خنزیر و شراب لحوم سباع آسار غیر ماکول اللحم اور دوسری بہت سی انواع ماکولات کو ناجائز اور ممنوع ثابت کر سکیں لیکن باب لباس میں اسی قسم کی دوسری دلائل ریشم۔ معرق زری۔ اوضاع کفار اور اطوار غیر مسلمین کو ناجائز نہ بنا سکیں؟

حقیقت یہ ہے کہ نکتہ چینیوں نے خود اس حدیث ہی کے الفاظ پر غور نہیں کیا اور نہ اس کے مدلول لغوی و شرعی کو سمجھے۔ حدیث میں جہاں یہ الفاظ ہیں کلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا وہیں آگے یہ لفظ بھی تو ہیں کہ فی غیر اسراف ولا مخیلۃ۔ یعنی کھاؤ پیو پہنو اور خرچ کرو جب تک کہ اس میں اسراف اور مخیلہ کا دخل نہ آئے۔ اس شرط کا حاصل یہ نکلا کہ جب کھانا پہننا فضول خرچی اور خیلاء و تکبر ناز و ترفہ اور اترا ہٹ کی حدود پر پہونچ جائے تو اس حد کے کھانے پہننے سے ترک جاؤ۔ پس تمام وہ کپڑے جنمیں اسراف و خیلاء ہو۔ تمام وہ اوضاع و اطوار جنمیں ناز نخرے و ترفہ اور اترا ہٹ کا پیچ ہو تمام وہ اطوار جنمیں عبدیت و تواضع کے بجائے کبر و رعونت اور توجہ الی اللہ کے بجائے توجہ الی النفس ہوتی ہو۔ اور تمام وہ کھانے جنمیں فضول خرچی یا دوسرے مفاسد لازم آئیں اور وہ سب ہی کفار کی شعار ہیں اسی آیۃ و حدیث سے ممنوع اور ناجائز ٹھہر گئے۔ جنکی خصوصی تفصیلات دوسری آیات و احادیث نے کر دی ہیں جنکو ہم پہلی فصلوں میں بسط کیساتھ لکھ چکے ہیں۔

پس جس حدیث کو سید صاحب جواز تشبہ میں استعمال کر رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں وہی حدیث منع تشبہ کے لئے ایک زبردست استدلال ہے پھر عجیب بات ہے کہ سید صاحب تو آخر میں فرماتے ہیں کہ

"ہم ان روایتوں سے کسی قسم کی پوشاک پہننے سے ممنوع نہیں معلوم ہوتے تو لفظ تشبہ کو مشابہت ذی و لباس پر بھی حمل نہیں کر سکتے" (تہذیب الاخلاق ص ۳۳ ج ۱)

اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

اس کی ساتھ ستر ہزار یہود طیلسان پہنے ہوئے ہونگے۔ حضور کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک مسلم جماعت کو دیکھا کہ وہ طیلسان پہنے ہوئے ہیں تو کراہت سے فرمایا۔

ما اشبہہم بیہود خیبر۔	تعجب ہے کہ یہ لوگ خیبر کے یہود سے کس قدر مشابہ ہو گئے۔

تو حضرت انس نے تو تشابہ کو مشابہت زی ولباس ... پر حمل کیا۔ اور سید صاحب تشابہ سے الگ ہو کر تشبہ کو مشابہت زی ولباس پر منطبق کرنا نہیں چاہتے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ابن قیم اس واقعہ کو نقل کرکے فرماتے ہیں۔

ومن ههنا كره لبسها من السلف والخلف لما روى ابوداؤد والحاكم في المستدرك عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال من تشبه بقوم فهو منهم وفي الترمذي عنه صلى الله عليه وسلم ليس منا من تشبه بقوم غيرنا (زاد المعاد ج ا ص ...)	اور یہیں سے سلف وخلف نے طیلسان پہننا مکروہ سمجھا ہے۔ کیونکہ ابوداؤد نے ابن عمر سے اور انہوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جس نے کسی قوم کی ساتھ مشابہت پیدا کی وہ اسی قوم میں سے ہوگیا اور ترمذی میں یہ روایت ان الفاظ سے ہے کہ ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جس نے ہمارے غیر قوموں سے تشبہ کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء سلف وخلف نے بھی اس تشابہ کو زی ولباس پر محمول کیا ہے۔ پس جبکہ تحقیق ہو گیا کہ [illegible] اس حدیث کا محل لباس و زی و ہیئت بھی [illegible] تو [illegible] خیال [illegible] سید صاحب کی [illegible] نہیں ہے کہ [illegible] قبول کر سکیں۔ [illegible]

[illegible]

گیا کہ اگر حضورؐ لندن و جرمن میں آتے تو آپ کا لباس وہیں کے باشندوں کا سا (ہیٹ، کوٹ پتلون وغیرہ) ہوتا۔ اور اس وہمی جسٹ یہ سے مجتہدانہ طور پر فتویٰ یہ نکلا کہ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کو نصرانیوں کا لباس پہننے میں کوئی شرعی حرج نہیں۔ ان چاروں اجزاء پر ہم جدا جدا نظر ڈالتے ہیں۔

صحابہ و مشرکین کی حلہ میں مشابہت

اوّل تو ہم حلہ کی حد تک تشبہ کا تعلق ہی تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ حلہ جس کے معنی چادر اور تہبند کے ہیں فی نفسہ کوئی صورت اور وضع ہی نہیں بلکہ اصل لباس اور مادۂ لباس ہے۔ اور اسی لئے حالت احرام میں جبکہ ترک تزئین کے دائرہ میں سِلے ہوئے کپڑے کی ہر وضع قطع چھوڑ دیجاتی ہے تو اس اصل لباس (حلہ) ہی کو باقی رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ستر بدن کے لئے اس سے کم اور کم سے کم کوئی اور لباس ہی نہیں۔

پس یہ اصل لباس ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تشبہ کا تعلق صور و وضع سے ہے نہ کہ اصول اور مواد لباس سے اگر حلہ میں بھی منع تشبہ کا حکم جاری کیا جائے تو اسکے معنے یہ نکلیں گے کہ اصل لباس اور مادۂ لباس کو چھوڑ دو اور عریانی اختیار کرلو۔ اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ مشابہت کفار کے خوف سے سرے سے کھانا پینا۔ ناک کان رکھنا۔ عبادۃ کرنا انسان رہنا بلکہ زندہ رہنا ہی ترک کرانے کی سعی کیجائے۔ حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ان جیسے اصول امور سے تشبہ کا کچھ بھی تعلق نہیں۔

(۲) پھر اگر تہبند کو فی نفسہ نہ سہی لیکن فی غیرہ کوئی وضع تسلیم بھی کرلیں بایں معنیٰ کہ یہ مادۂ لباس ہی کسی غیر مسلم قوم کا امتیازی شعار ہو جائے۔ جیسا کہ مشرکین مکہ کا تھا تو پھر ہم یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حلہ کو بلا قید و شرط اور بلا وجوہ تمیز ٹھیک اسی طرح استعمال کرنا جائز قرار دیا جس طرح مشرکین پہنتے تھے۔ کیونکہ مشرکین تو اس حلہ کی ازار کو خیلاء و تکبر سے ٹخنوں سے نیچے گھسیٹتا ہوا پہنتے تھے اور آپ نے حکم دیا کہ

ازرۃ المؤمن الی نصف الساق ولا حرج	مومن کی ازار نصف پنڈلی تک ہے اور اگر

فیما فوق الکعبین ۔ | نیچی بھی ہو لیکن ٹخنے نہ ڈھکیں تب بھی کوئی حرج نہیں ۔

مشرکین تو اپنی روایتی قدموں سے دو تک گندی ہوئی استعمال کرتے اور اسبال کرکے ان کے دامنوں
کو لٹکانا اور گھسیٹنا چھوڑتے تھے۔ جیسے عموماً متکبر سلاطین اور جبابرہ کی چادروں کا بھی طرز ہے۔ لیکن
آپ نے اسبال کو اپنے اور اپنے صحابہ کے لئے حرام فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حرمت محض منع تشبہ ہی کے
مد میں تھی۔ کیونکہ اگر بالفرض آپ بلا ان قیود کے بعینہ مشرکین ہی کا سا رعونت نشان اور کبر آثار
حلّہ استعمال فرماتے تب بھی یہ تو ناممکن تھا کہ آپ کے مصفّٰی قلب میں کبر و رعونت کے آثار راہ پا سکتے
جو ان مشرکین کے تھے۔ لیکن پھر بھی ان قیود کا اضافہ فرما کر حلّہ کو استعمال فرمانا سوائے ترک تشبہ کے
اور کس لئے ہو سکتا ہے۔ اور اگر امت مرحومہ کی تاسی کے لئے تھا تو اسکی غایت بھی یہی نکلتی ہے کہ امت
کو باطناً کبر و رعونت سے اور ظاہراً تشبہ بالاقوام سے الگ رکھا جائے۔

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حلّہ استعمال فرمانا اور ان حدود کی رعایت کے ساتھ استعمال
فرمانا منع تشبہ کی تو ایک کھلی دلیل بن سکتا ہے لیکن جواز تشبہ پر اس سے کیا روشنی پڑ سکتی ہے۔ جو
سید صاحب کا منشا ہے۔

(۳) لیکن اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے کہ آپ نے مشرکین مکہ ہی کا سا لباس پہنا اور مسلمین و
مشرکین میں مشابہت بھی پیدا ہو گئی تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ یہ تشبہ عارضی اور
چند روزہ تھا۔ اسلئے قابل التفات نہ تھا۔ کیونکہ کفار حجاز کے لئے اسلام اور قتل کے درمیان جزیہ کا
واسطہ ہی نہ تھا۔ اسلئے مشرکین حجاز ذمی ہو کر نہیں رہ سکتے تھے۔ یا تو یا مسلمان ہو جانیوالے
تھے یا مقتول اور جبکہ ہر صورت میں سرزمین حجاز ہمیشہ کے لئے غیر مسلم افراد سے پاک ہو جانیوالی
تھی۔ تو حجاز میں چند دن کے بعد تشبہ کا وجود ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ پس ایسے چند روزہ ظاہری
تشابہ کے خوف سے حلّہ جیسے زیبا آثار لباس کو ترک کر دیا جاتا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا۔

بہرحال اس تجزیہ سے یا تشبہ بالکفار کا وجود ہی نہیں نکلتا یا نکلتا ہے۔ تو اس کا بلا ترمیم
و تنسیخ اور بغیر اقامۃ حدود و زیر عمل آنا نہیں نکلتا اور اگر یہ بھی نکلتا ہے تو وہ عارضی اور چند روزہ ہے تشبیہ

اقتدار کے دائرہ میں آکر ضروری الاتباع ہوگئیں خواہ وہ تعبدی ہوں یا عادی اور اکل و شرب کے
بارہ میں ہوں یا لباس اور وضع قطع کے۔

ادھر انھیں اسمٰعیل علیہ السلام کا لباس جنکی اقتدار کا قرآن نے حکم دیا۔ فاروق اعظم خلاف
ثابت فرما رہے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے آذربائیجان کے عربوں کو تہبند پہننے ہی پر یہ کہکر آمادہ کیا
ہے کہ وہ تمہارے باپ اسمٰعیل علیہ السلام کا لباس ہے۔

فاتزروا وارتدوا وعلیکم بلباس ابیکم اسمٰعیل۔ (اقتضاء الصراط المستقیم)

ازار و رداء استعمال کرو اور اپنے باپ اسمٰعیل علیہ السلام کا لباس پہننا ضروری سمجھو۔

پس آیۂ مشورہ کے ماتحت حضورؐ کے لیے اس خلق میں اقتداء اسلاف صالحین کا دخل آگیا تو
کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے یہ لباس اپنی مشرک قوم کے رسم و رواج کے ماتحت پہنا۔

پس اس حسن ظن کی جو نکتہ چینیوں کے کلیہ کی اساس تھا بنا ہی منہدم ہو گئی پھر بھلا
اسپر کیا ست کی کوئی مضبوط عمارت کھڑی کرکے دکھلا دیجئے۔

پس اب نکتہ چینیوں کے لئے اس کے سوا کوئی میدان باقی نہیں ہے کہ وہ اس کلیہ کی
بنیاد اس حسن ظن پر قائم کرنے کے بجائے کسی اور چیز پر قائم کریں جو کہیں معلوم ہو تو
پھر ہم محض اس کلیہ ہی کو سامنے رکھکر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی رسالۃ کی انتہائی توہین اور
حضرت حق کے مقابلہ میں انتہائی جسارت اور بیباکی ہے کیونکہ اسکے یہ معنی ہونگے کہ لباس یا عام معاشرۃ کے بارہ میں نبی کے پاس حق کی
قلبی داعیہ کوئی اشارۂ باطن اور کوئی غیبی الہام نہیں ہوتا کہ وہ اس کا اتباع کرے بلکہ اس
بارہ میں وہ بھی منجملہ افراد ناس کے ایک فرد ہوتا ہے جو اپنی قومی معاشرۃ کا پابند اور رسم
و رواج کا مقلد بنکر آتا ہے۔

اور پھر مقلد بھی اسی قوم کا جس کی ہدایت کے لیے خود اسی کی بعثت ہوئی تھی۔ اور
اس لیے ہوئی تھی کہ اس قوم کے عقائد و اعمال اور خیالات کے مفاسد و مظاہر سب ہی اتنے
بگڑ چکے تھے کہ نبوت کے سوا کوئی طاقت بھی اس بگاڑ کی اصلاح نہیں کر سکتی تھی۔

اور پھر اُوپر سے معاشرہ کی اس کورانہ تقلید کا الزام اس عظیم الشان نبی پر بھی لگایا جائے جس نے دنیا میں آکر محض اپنی غیبی طاقت سے نہ صرف معاد ہی کی اصلاح کی تھی بلکہ معاش اور تمدن کے بھی اچھے سے اچھے نمونے قائم فرمائے تھے۔ اور کوئی خلق و عمل صورت و سیرت۔ اور عادت و عبادۃ ایسی نہیں چھوڑی تھی جس کے متعلق اُمت مرحومہ کو ہدایت کی روشنی نہ دی ہو۔ جس کی وجہ کی جامعیت پر دشمنوں کو حسد ہی اسلئے تھا کہ وہ اتنی مکمل کیوں ہے؟ کہ انہیں بول و براز تک کے آداب سکھلا دیئے گئے ہیں۔ اور جس کے اکمال دین اور اتمام نعمت کو دوست ہی نہیں بلکہ دشمن بھی ان ظاہر آیتہ الفاظ میں تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ۔

مایدع ھذا الرجل شیئا	یہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی چیز بھی کہا
الا خالفنا فیہ۔	چھوڑنا نہیں چاہتا۔

کہ اس میں ہمارا خلاف نہ کرے یعنی اُس کی ملت کے کسی شعبہ کی بنا اغیار کے اتباع پر قائم نہیں بلکہ محض دینی آوردہ ہدایت کی روشنی پر کہ لیلھا و نھارھا سواء۔

پس کسی نبی کا اور خصوصاً حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی معاملہ میں خواہ وہ لباس کا ہو یا تعبد کا خالی از الہام ربانی ماننا بلکہ دور اُلٹا اسکو عامۃ اہل ہونے کا تابع تسلیم کر لینا ایک ایسی نارو اجسارت ہے کہ ہر ایک اسلامی ضمیر بھی اسپر اظہار نفرت کرے گا اور اسے اپنی تعلیم بھی اُسکے تمسخر لئے بغیر نہ رہ سکیگی۔

قرآن کریم تو دعویٰ کرے کہ۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ	تمہارے لئے رسول اللہ
اُسوۃ حسنۃ۔	بہترین نمونہ ہیں۔

اور پھر اس اُسوۂ حسنہ کو کسی خاص نوع عبادۃ، و معاد یا معاش سے مقید نہ کرے بلکہ مطلق ہر علم و عمل کا نمونہ رسول ہی میں ثابت کرے۔

پھر یہ شک دعوی کرے کہ عمل تو عمل نبی کی زبان کی ادنیٰ حرکت بھی ہوئی سے تابع نہیں ہو سکتی

بلکہ صرف وحی سے

وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحیٰ ۔

اور رسول ہوائے نفس سے کچھ نہیں بولتا وہ تو وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے ۔

پھر یہ بھی بتلا دیا کہ قول بھی بڑی چیز ہے نبی کے تو طبعی اور جبلی اخلاق بھی پست اور ہوا پرستانہ نہیں ہوسکتے

وانک لعلیٰ خلق عظیم ۔

اور تو اے نبی خلق عظیم پر ہے ۔

جس سے پوری طرح کھل جائے کہ نبی کے عملی، قولی اور اخلاقی اسوے سب کے سب لامحالہ من اللہ ہی ہوں گے ۔ اور پھر یہ بادی قرآن اسی پر بس نہ کرے بلکہ نبی کو کھلے لفظوں میں ہدایت بھی دے کہ ۔

ثم جعلناک علیٰ شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون ۔

پھر ہم نے آپکو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا ہے سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائے اور ان جہلاکی خواہشوں پر نہ چلئے ۔

جس سے بالکل یہ مسئلہ کھل جائے کہ معاش و معاد کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق رسول کے پاس فیض الہام ۔ اشارۂ باطن اور داعیۂ قلب سلیم موجود نہ ہو اور اسے لباس وغیرہ میں عامۂ اہل ہوا کی پیروی کرنی پڑے ۔ لیکن نکتہ چین جنکو فقہ باطن سے کوئی حصہ نہیں دیا گیا یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہ شرمائیں کہ انبیاء کی ذوات قدسی صفات تو جس مرز و بوم اور جس قوم میں مبعوث ہوتی ہیں اسی قوم کی معاشرت اور لباس کی پابندی پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ ان کے پاس اس بارہ میں کوئی روشنی ہی نہیں ہوتی ،

معاذ اللہ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا ۔

کیا یہ خدائی ہدیٰ و رسالت کی تکذیب بلکہ موضوع رسالت کی تغلیب اور قرآن کریم کی آیات بینات کا صریح مقابلہ و معارضہ نہیں ہے ؟ ۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے حقیقت کو سمجھا ہی نہیں ۔ اگر آپ نگاہ حقیقت بین رکھتے تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی معاشرت اور لباس وغیرہ ان کے نور تقویٰ و طہارت ۔ صبر و قناعت زہد فی الدنیا اور رغبت فی الآخرۃ کے تابع ہوتے ہیں ان کے لباس پر انہی اخلاق فاضلہ کا رنگ چھایا رہتا ہے ان کی معاشرت زاہدانہ اور قانعانہ ہوتی ہے ۔ وہ تعلق مع اللہ اور رجوع و انابت الی اللہ پھر غلبۂ قلب کے سبب کم سے کم کھانے اور کم سے کم پہننے پر اپنے اشارات باطن سے ہر وقت راضی اور

اسمٰعیل ۔	کا لباس ضروری سمجھا۔

نیز ابراہیم علیہ السلام کا لباس بھی حلہ ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ افعال حج درحقیقت افعال ابراہیمی کی نقل ہے اور ان میں احرام (جو حلہ ہے) واجبات مناسک میں سے ہے۔ پس گویا امت مسلمہ کے ہر شاہ و گدا پر لازم کر دیا گیا کہ کم سے کم ایک دفعہ عمر بھر میں لباس میں بھی ابراہیم علیہ السلام کی اقتدا کرے

قرائن و شواہد

(۱) ۔۔۔ پھر اگر قرائن جمع کئے جائیں تو ان سے بھی اندازہ ہو سکیگا کہ لباس انبیاء حلہ ہی ہے۔ حدیث صحیح سے ثابت ہو چکا ہے کہ اہل جنت کا لباس بھی حلہ ہی ہوگا۔ اور اہل معرفت کہتے ہیں کہ تمام وہ نعم جو جنت کے ابتدائی درجات میں عوام مومنین پر فائض ہونگی۔ انبیاء علیہم السلام پر دنیا ہی میں فائض کر دیجاتی ہیں۔ پس یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ انبیاء علیہم السلام دنیا ہی میں اہل جنت کی ذی ہیئت اختیار فرمالیں کہ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی جنت ہی میں مقیم رہتے ہیں۔

(۲) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابق کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔

اولٰئک الذین ھدی اللہ	یہی (انبیاء مذکورین) ہیں کہ خدا نے انہیں سچے رستے کی ہدایت
فبھداھم اقتدہ ۔	کی پس آپ بھی انکی ہدایت کا اتباع کیجئے۔

اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ آیت میں اقتداء مطلق ذکر کی گئی ہے نہ اسے اخلاق سے مقید کیا گیا ہے نہ کسی قسم کے افعال و اعمال کی اسمیں تخصیص کیگئی ہے۔ پس مطلقاً ہر غیر منسوخ شے میں اقتداء سلف مراد ہوگی جس میں معاشرۃ و لباس بھی داخل ہے۔

اور یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آپ کا لباس حلہ ہے تو یہ قرینہ ہے کہ انبیاء سابقین کی معاشرت بھی یہی ہو ورنہ آپ کا لباس تک بھی دائرہ اقتداء سے خارج تھا۔ پس انبیاء سابقین کا لباس حلہ ہونا بطور اقتضاء النص اسی آیت سے ثابت ہو جاتا ہے جو قطعیت کا مرتبہ لئے ہوئے ہے۔

(۳) نیز جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جیسی مکمل و مکمل ذات کے لئے اقتداء سلف کا حکم دیا گیا

توعقل سلیم شہادت دیتی ہے کہ ضرور سابقین میں بھی ہر خلف کو اپنے سلف کی اقتدار کا حکم دیا گیا ہے اور دین کے آداب میں سے اس اتباع و اقتدار کو خصوصیت سے اہل دین کا امتیازی شعار بنا دیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس اصول اتباع و اقتدار کا طبعی تقاضا یہ ہو کہ ہر پچھلے نبی کی دینی معاشرت اگلے کی اقتدار میں ہو۔ مثلاً جیسے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس عیسیٰ علیہ السلام کی اقتدار میں ہو اسی طرح لباس عیسوی تابع ہے انبیاء تورات اور موسیٰ علیہ السلام کے اور اُن کا اُن سے سابق انبیاء کی اقتدار میں پس اس قرینہ سے بھی تمام انبیاء کا عمومی لباس حلّہ ہی نکل آتا ہے۔

دسم، نیز فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے عاشق نبوی کا قوم کو حلّہ پر ابھارنا اور اس بارے میں جناب خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وسلم کی اقتدار کی بجائے اسمٰعیل علیہ السلام کی اقتدار پر آمادہ کرنا بھی اسی کی دلیل ہے کہ حضور کا اور اسمٰعیل علیہ السلام کا ایک ہی لباس تھا اور یہ کہ آپ نے انہی کی اقتدار میں حلّہ پہنا کیونکر اس کا حاصل یہ ہوگا کہ تم لباس کے بارے میں اُن کی اقتدار کرو جنکی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کی اور جبکہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اسمٰعیل کی اقتدار کروگے تو تمہیں دو اقتداؤں کا شرف ملیگا۔ ایک اقتدار محمدی کا اور ایک اقتدار اسمٰعیلی کا۔ غرض اس سے یہ واضح ہوگیا کہ زہد و قناعت کا لباس ہر قرن میں خواہ وہ عہد اسمٰعیلی ہو یا عہد محمدی ایک ہی نوعیت کا رہا ہے اور جس میں کسی مرز و بوم کی تمدنانہ خصوصیات کوئی اثر نہیں کر سکی ہیں۔

(۵) پھر مذہبی اقوام میں عام مقتدایان مذاہب و پیروان اسلاف کی لباسی سادگی بھی یہی بتلا رہی ہے کہ اُن کے پیشرو بھی لباس کے درجہ میں زہد و قناعت کے سبب حلّہ ہی استعمال کرتے تھے جسکو جاہل اخلاف نے اپنی نافہمی اور مرور ایام کے سبب اسطرح مسخ کردیا جس طرح اُن کے مذاہب اور اصول و فروع کو مسخ کردیا اور اپنے تعمق اور غوص کے سبب زہد و قناعت کی حدود سے گذر گئے۔

مثلاً جوگیوں نے اپنے پیشرؤں کی تقلید میں جانگیہ یا لنگوٹی دڑا نگوچھا اختیار کر لیا۔ یہ جانگیہ یا لفت تہ بند اسی اصل تہ بند کا مسخ شدہ ہے جس کو قناعت کے غوص میں ڈر لنگوٹی تک سٹ دیا۔ اس سلے یہ پہنچایا گیا ہو کہ ان نافہم زہاد کے نزدیک واجب الستر اعضاء صرف آلات بول و براز ہوں

بقیہ کا ستر واجب ہی نہوا در غیر واجب کے پیچھے پڑنا اسراف اور اضاعۃ سمجھکر صرف اس حد پر قناعت کر لی گئی ہو۔ لیکن ان میں سے جو پیالباس پہنتے ہیں وہ تقریبًا دہی ایک چادرہ اور تہ بند پر مشتمل ہوا ہو گا سکی اصلی ہیئت کو پھر بھی مسخ کر دیتے ہیں۔ پس بہت ممکن ہو کہ جس طرح ان نادانوں نے اپنے اسلاف کا رجو بہت ممکن ہو کہ مردان حق ہوں) دین مسخ کر دیا اسی طرح ان کی معاشرۃ ولباس کو بھی مسخ بنا کر ان غیر فطری ہیئتوں تک پہنچا دیا ہو۔

یا مثلاً زاہدوں نے اقتدا اسلاف میں زہد کے تعلق سے اشتمال واختیار شروع کر دیا۔ یعنی ایک چادرہ میں اوپر سے نیچے تک اپنے آپکو لپیٹ لینے پر اکتفا کر لیا اور یہ شاید اسلئے کیا گیا ہو کہ دو کپڑوں میں طوالت ثواب اور طوالت عمل تھی جسکو باعث تشویش اور خلاف زہد سمجھا ہو پس دو چادروں کے بجائے ایک ہی لفافہ استعمال کرنے لگے اور اصل حلہ کو مسخ کر دیا۔ اور فقدان فراست کے سبب یہ نہ دیکھا کہ صرف ایک کپڑے سے ستر پوشی پوری طرح نہیں ہو سکتی جو کپڑے سے مقصود تھی۔ پس ایک جانب (زہد) کی رعایت میں منہمک ہو کر اور تمام جوانب (مثلاً ستر و تعفف) کی رعایت کرنا بھول گئے اور اس نوع کے مقصود کو غیر مقصود سے بدل دیا۔

پس ان زہد میں تعمق رکھنے والی اقوام کو اپنے اسلاف کے زہد کی صورت تو یاد رہ گئی کہ محسوس تھی مگر حقیقت پر متنبہ نہ ہو سکا کہ وہ نور باطن ہی سے منکشف ہو سکتی ہو۔ اسلئے بلا حکمت و تفقہ کی لباس اخلاف کی محض نقل اتارنا شروع کر دی اور نا فہمی سے اس کو اس ممسوخ ہیئت تک پہونچا دیا کہ اس کی اصلی ہیئت گم ہو گئی۔

پس ہنود و یہود وغیرہ کے ان فنائی المذہب اور مستہلک فی الزہد اشخاص کو دیکھکر اگر ہم اس نتیجہ پر پہونچیں تو بجا ہو گا کہ ان کے اسلاف اور اولین داعیان مذاہب جنکی پیروی میں یہ اشخاص آجتک زہد و قناعت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور جنمیں سے بعض کے حقانی ہونے پر اور بعض کے بارہ میں ساکت کسی مرز و بوم کے ہوں اپنے لباس و معاشرۃ کے دائرہ میں کسی قومی اور وطنی رواج کے تابع نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے قلبی اخلاق و شمائل زہد و ورع، تقویٰ و استغنا اور قناعت کے ماتحت

کی ایک ہی زاہدانہ اور قانعانہ وضع رہی ہے اور کسی مرز و بوم کے کسی تمدن نے اُن کو اس قناعت و زہد کے جادہ سے نہیں ڈگمگایا۔

ان واقعات و شواہد کے مقابلہ میں یہ کلیہ کس قدر مضحکہ انگیز اور طفلانہ ہے کہ ہر وطن کے انبیاء علیہم السلام اسی وطن کے رسم و رواج کے تابع ہوتے ہیں وہ لندن میں آئیں تو ہیٹ و کوٹ پہننے لگیں۔ ایران میں آئیں تو کج کلاہ بن جائیں، اور ہندوستان میں آئیں تو اچکن و چپکن اور بانکی پگڑیاں استعمال کرنے لگیں۔ یعنی ان کا کوئی اپنا داعیہ عقلی ہی نہ ہو جس کی وہ پیروی کریں۔ بلکہ وہ بھی معاذ اللہ ابنائے وطن کی طرح بجائے تدین کے تمدن اور بجائے تمکن کے تلون ہی کے دلدادہ ہو کر دنیا میں آتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کی جیسی معاشرت دیکھتے ہیں ویسا ہی کرنے لگتے ہیں۔

پھر صد حیرت و تعجب ہے کہ اس دور الحاد و دہریت اور بعید از سلامت قرن میں تو ان دعاۃ مذاہب کے پیرو ہندوؤں کے جوگی، نصرانیوں کے راہب، یہودیوں کے احبار، بودھ مت کے بھکشو اور مسلمانوں کے متصوف دنیا کے مختلف سرد و گرم خطوں چین و جاپان اور ہند و ایران وغیرہ میں اس قدیم زاہدانہ وضع کو اپنے فہم و مقدور کے موافق برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہیں اور کسی مرز و بوم کی خصوصیات اُن کی اس پختگی میں سستی پیدا نہ کر سکیں۔

لیکن وہ آپ کی عقل سلیم پھر بھی اسے ہی جائز تصور کرتی رہے کہ ان پیروؤں کے سلف اگر ترک ہند و ایران، و چین و جاپان وغیرہ میں ہوتے تو تمدنوں کے نقش قدم کی کورانہ تقلید میں لگ جاتے، اور ہر ملک کے موجودہ تمدن کی گود میں، وہاں کی معاشرت کے تعلقات انہیں پھسلا دیتے اور اُن کے زہد و قناعت کی کچھ بھی پیش نہ جاتی۔ گویا وہ تو تدین میں اپنے پیروؤں سے بھی گئے گذرے ہو جاتے۔ وہاں کے لچکیلے تمدن میں اپنے پیشرو دین کو بھی پیش پیش ہو جاتے۔ یا بالفاظ دیگر تدین کی جڑیں تو تمدن کی خشک سالی سے سوکھ جاتیں لیکن تمدن کی شاخیں پھر بھی ہری بھری رہتیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

بہر حال یہ کلیہ کسی طرح عقلاً، نقلاً، عرفاً، تجربۃً، مشاہدۃً باور کرنے کے قابل نہیں کہ انبیاء

نظیر اسلام لباس و معاشرۃ میں اپنے رجال وطن کے تابع اور ملکی خصوصیات کے زیر اثر ہوتے ہیں
کیونکہ اس کے باور کرلینے میں حقیقی متبوع کا تابع ہوتا اور تابع کا متبوع ہونا لازم آئیگا اور یہ موضوع
رسالت کو الٹ دیتا ہی۔ اعاذنا اللہ منہ۔

(۴) جبکہ یہ کلیہ ہی ساقط الاعتبار اور محض فرضی رگیا تو اس سے اس خاص جزیہ کا استنباط کرتا
اور بھی زیادہ ناقابل وقعت اور غیر قابل التفات ہے کہ اگر حضور لندن و جرمن میں آتے تو وہیں کے
لوگوں کا سا لباس استعمال فرماتے؟

لیکن تاہم اس جزیہ کو ہم بجائے لاشئے ہونے کے ایک شئے فرض کرکے کہتے ہیں کہ اول تو
یہ محض ایک موہوم امر اور معلق حکم ہی کہ اگر آپ لندن آتے تو ایسا کرتے کیونکہ اگر ایسا ہوجاتا تو بلاشبہ
ہم بھی مان لیتے لیکن جبکہ ایسا نہیں ہوا تو آپ ہی کو قبل از وقت واویلا کرنے کی کیا ضرورت داعی
ہوئی اور آپ کیوں حقائق کو چھوڑ کر وہمیات کے جال میں پھنس گئے۔؟

لیکن میں کہتا ہوں کہ اس جزیہ کو شرطیہ بنانا اور لفظ اگر سے تعبیر کرنا غلط اور نادانی
محض ہے بلکہ یوں کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لندن و جرمن تشریف لیگئے اور پھر بھی وہاں کی زی و ہیئت
کو ناپسند فرمایا اور کراہت کے سبب ٹھکرا دیا۔ کیونکہ کسی موطن کی طرف جانا یا کسی چیز سے قریب و بعید
ہونا محض مکان ہی کی حیثیت سے نہیں ہوتا بلکہ علم کی حیثیت سے بھی ہو سکتا ہی۔

حق تعالی نے بندوں سے اُن کی شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہیں لیکن علمی مسافت کے لحاظ سے
نہ کہ مکانی و زمانی مسافت سے کہ وہ ان مخلوقات سے بہت بالا ہیں۔ حق تعالی کو مخلوقات سے
ہر آن معیت ہے لیکن نہ زمانی و مکانی کی حیثیت سے بلکہ علمی حیثیت سے کہ یہی اُن کی شان کے شایان
بھی ہے۔ اسیطرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام ممالک میں تشریف لے گئے۔ لیکن
نہ مکانی حرکت سے بلکہ علمی حرکت سے اور یہی آپ کی اعلی شان کو زیب بھی دیتا تھا کیونکہ جب آپنے
علمی اور باطنی حیثیت سے لندنیوں و جرمنیوں کے تمام اُن خصوصی لباس و مسائل سے ہمیشہ کیلئے
مخالفت فرمادی جو کبھی دور میں ان کا شعار اور مابہ الامتیاز قرار پا جائیں تو بلاشبہ آپ نے

لندن وجرمن کیطرف تشریف ارزانی فرمائی جو نقل مکانی سے کہیں بڑھکر قوی اور مفید احکام ثابت ہوئی۔ پس جبکہ ایک عالم کل اپنے گوشہ میں بیٹھکر تمام دنیا کے لیے دستور العمل دیسکتا ہی۔ تو آپکو آخر کس چیز نے مجبور کیا ہی کہ آپ اُس سکے لئے دنیا کے ہر ہر گوشہ میں بھاگ دوڑ تجویز کریں اور اسکی شان سے گری ہوئی تکلیف کا اُسے مکلف بنائیں۔

پس اب اگر ضرورت رہجاتی ہے تو صرف اسکے معلوم کرلینے کی کہ آج لندنیوں اور جرمنیوں کا وہ کونسا لباس ہے جس کو پہنکر ایک شخص لندنی اور جرمنی سمجھا جاسکتا ہی تا کہ اس قضیہ شرطیہ کی کہ اگر حضور لندن وجرمن پہنچ آتے تو ایسا ہوتا۔

بہرحال یہ جزیہ شرطیہ اس لحاظ سے تو نہایت مہمل اور لغو تھا ہی کہ اس کا مبنیٰ جو کلیہ بنایا گیا تھا وہی فرضی اور وہمی شکل آیا تھا۔ لیکن اگر صرف اس جزیہ ہی کو مستقلاً سامنے رکھا جاسے تب بھی یہ واضح ہو جاتا ہی کہ اُسکی حقیقت ایک مغالطہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

پس اس فرضی جزیہ پر قیاس کرکے سید صاحب کا یہ فتویٰ دینا کہ ہندوستانی مسلمان مسترجہ مردوں کی طرح ہر غیر قوم کے لباس کو بے تکلف اختیار کرکے اپنی غیرت وحمیت کا خون کریں اور بھی زیادہ بیجا اور بے معنی ہوگا۔ اور اسکی کسی ایسے شخص سے توقع نہ کی جاسکے گی جس کو علم و فہم سے کوئی ادنیٰ حصہ عطا ہوا ہو۔

فصل

پانچواں شبہ

سرسید تہذیب الاخلاق کے صفحہ ۱۰ پر قمطراز ہیں۔

کیا ادنیٰ مشابہت سے مثلاً دھوتی باندھ لینے سے یا انگیٹھی وغیرہ پر چڑھنے سے
یا ظاہری مشابہت کر لینے سے باوجود اقرار توحید و رسالت کے آدمی کافر ہو جاتا ہے؟
حاشا وکلا۔ پس اصل یہ ہے کہ یہ حدیث (من تشبہ بقوم فھو منھم) روایتاً و
درایتاً دونوں طرح پر مردود ہے۔

اس شبہ کو استفہام انکاری کی عبارت میں پیش کیا گیا ہے جس میں تشبہ کے کفر ہونے کا انکار اور
اسلئے اس کے جائز العمل ہونے کا اقرار پیش نظر ہے۔

اس استفہام انکاری اور اس کے نتیجہ اقراری کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

کیا ہم تشبہ کی ان چھوٹی چھوٹی جزئیات اور جزوی مشابہتوں سے
کافر ہو جائیں گے؟

"یعنی ہرگز کافر نہ ہوں گے"۔ اور جب کافر نہ ہوں گے تو پھر کفار سے اس ظاہری مشابہت پیدا
کر لینے میں کیا حرج ہے؟ پس سوال کا منشا یہ نکلا کہ اگر تشبہ سے کفر لازم آتا تب تو وہ قابل
اجتناب چیز بنتا ورنہ نہیں۔ اس منشا کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھلے طور پر اس عبارت سے
ایک دعویٰ تو یہ نکلا کہ۔

(۱) ممنوع اور منہی عنہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو کفر ہو۔

نیز جبکہ نکتہ چینیوں کے زعم میں تشبہ کی یہ ظاہری اوضاع کفر تک نہیں پہونچاتیں اور
ایمانی حقیقت پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا تو انکی اسی عبارت سے دوسرا دعویٰ یہ نکلا۔ کہ

(۲) ظاہر باطن میں مؤثر نہیں یعنی ظاہری عمل باطنی کیفیات پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔

نیز اس استفہام میں تشبہ کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو تحقیر کے ساتھ ذکر کردینے سے الزاماً ایک تیسرا دعوی یہ بھی نکلا کہ۔

(۳) کسی منہی عنہ یا مامور بہ کی عام جزئیات قابل التفات نہیں ہوتیں بلکہ مامور و منہی کا فی الجملہ امتثال کافی ہے۔ گویا اگر ترک تشبہ اور مخالفت کفار مطلوب بھی ہو تو اس امر کے ذریعہ صرف اس کی حقیقت مطلقہ طلب کی گئی ہے جو ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینے سے بھی ادا ہو جاتی ہے اور ترک تشبہ کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ تارک تشبہ بننے کے لئے اسکی ہر ہر جزئی پر ہی عملدرآمد کیا جائے۔

شبہ کے یہ تین عمود ہیں جن پر اس شبہہ کی تعمیر اٹھائی گئی ہے اگر یہ ستون گر پڑیں تو یقیناً ساری عمارت بھی اپنی چھت سمیت گر پڑیگی۔ اور نکتہ چین بے پناہ رہجائیں گے۔

ہم بتوفیق اللہ وعونہ ان تینوں من گھڑت اصول پر جدا جدا تنقیدی نظر ڈالیں گے تاکہ شبہہ کا یہ نظر فریب طلسم کھلجائے۔ اور سراب کے بجائے پیاسوں کے لئے آب حیات ظلمتوں سے نکل آئے۔

کیا منہی عنہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو کفر ہو؟

نکتہ چینوں کا یہ اصول کہ منہی عنہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو کفر ہو، ایک کھلی ہوئی نادانی اور لغویت ہے۔ کیا اگر تشبہ اسلئے ممنوع نہ ہو کہ وہ اپنے تمام شعبوں کے لحاظ سے کفر نہیں تو ان نکتہ چینوں کے نزدیک شراب خواری، قمار بازی، زناکاری، چغلخوری، بہتان بندی، [illegible] نظر بازی، نقش پردازی وغیرہ تمام کبائر بھی ممنوع نہ ہونے چاہئیں کہ [illegible] محض ان افعال کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا [illegible] اگر یہ اصول نکتہ چینوں [illegible] اور صحیح مسلم تھا تو کیا اچھا ہوتا کہ [illegible]

روشنی ڈالتے جس طرح انہوں نے جواز تشبہ پر رقم نمائی کی ہی۔

پھر یہ عجیب قسم کا اصول موضوعہ ہی کہ جس فعل کے ارتکاب سے آدمی کافر ہو وہ فعل جائز بھی ہونا چاہیئے۔ اسکے تو یہ معنی ہیں کہ کفر تو معصیت ہو سکتا ہی، لیکن ڈیناچر کا فسق و فجور اور اسکے تمام شعبے کوئی معصیت اور قباحت نہوں۔ گویا کفر سے تو آدمی کو ڈرنا چاہیئے لیکن معصیت اور فجور سے گھبرانیکی کوئی ضرورت نہیں یا بالفاظ دیگر خلود فی النار سے تو بچنا قرین عقل ہے لیکن دخول فی النار سے بچنے کی سعی محض ایک غیر ضروری جذ و جہد ہے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جسے معاصی اور فجور کا خوف نہیں اُسے کفر کا بھی قطعاً خوف نہیں۔ جو لوگ کسی نتیجہ کے مبادی اور وسائل سے نہیں گھبراتے وہ یقیناً اس نتیجہ سے بھی نہیں گھبراتے جو لوگ نگاہ بازی اور لمس اجنبیات سے نہیں بچنا چاہتے وہ زنا سے بھی نہیں بچنا چاہتے کہ یہ چیزیں مستقلاً کوئی حقیقت ہی اسکے سوا نہیں رکھتیں کہ وہ زنا کے ذرائع ہیں۔ جو لوگ راتوں کو مال کی تاک جھانک، نقب زنی اور مکانات کے بھید لینے سے نہیں گھبراتے وہ یقیناً سرقہ سے بھی نہیں گھبراتے کہ یہ چیزیں وسائل سرقہ ہونے کے سوا بالا صالۃ کچھ بھی نہیں ہیں۔

پس جو لوگ کفار کی صوری مشابہت سے نہیں گھبراتے وہ یقیناً ان کی باطنی مشابہت سے بھی نہیں گھبرائیں گے۔ کہ یہ ظاہری مشابہت ہی باطنی مشابہت کا ایک قوی ذریعہ ہونے کے سوا اور کیا وجود رکھتی ہی۔ اور اس باطنی مشابہت ہی کا نام کفر ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لئے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہی۔

ایاکم و محقرات الذنوب د حقیر حقیر گناہوں سے بہت پرہیز کرو کہ یہی عظیم گناہوں کا پیش خیمہ ہیں)

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہی کہ ایسے خفیف المعیار لوگ تشبہ سے اگر وہ کفر صریح بھی ہو تا ہرگز نہ گھبراتے اور ضرور اپنی ہوا کے موافق تشبہ کا ارتکاب کرتے۔ تشبہ کو اُن کا یہ کہکر جائز بتلانا کہ وہ کفر نہیں محض ایک فریب اور شریعت کو دھوکہ دینا ہی۔

ممکن ہے اُن کا یہ فریب کسی جاہل مخلوق پر چل جائے لیکن خدائے علیم پر تو نہیں چل سکتا۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام	در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست	با خدا تدبیر و حیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن
گر گہے اللہ در فریب زنی	از برائے سگے دوغ میزنی

پس وہ خدا کو دھوکہ دینے کا ارادہ کر کے سخت دھوکہ میں ہیں کہ اپنے ہی نفوس کو دھوکہ دے رہے ہیں وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون۔ فی قلوبہم مرض فزادھم اللہ مرضا۔

لیکن بہر حال اگر مان لیا جائے کہ تشبہ بالکفار کا کوئی شعبہ بھی کفر نہ ہو تو کفر کی نفی سے اسکے ممنوع ہونے کی نفی کیسے ہوگئی۔ یعنی محض نفی کفر سے تشبہ کا جواز کیسے ثابت ہوگیا؟ اور جب نہ ثابت ہوا تو نکتہ چینیوں کے اس نفی کفر کے استدلال سے ہمارے مقصد حرمت تشبہ پر کوئی بھی اثر نہ پڑا۔ ہو سکتا ہے کہ تشبہ مطلق کفر نہ ہو لیکن حرام ہو۔ پس جبکہ نکتہ چینیوں کے ناقص طرز استدلال سے انکی خلاف مرضی تشبہ کا باوجود کفر نہ ہونے کے منہی عنہ ہونا لازم آگیا تو سوال یہ ہے کہ یہ منہی عنہ تشبہ آپ کے نزدیک طاعت ہے یا معصیت؟ اگر طاعت ہے تو پھر آپ کو اس اصول کے موافق یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ زنا و شراب اور قمار و غیبت وغیرہ بھی باوجود ممنوع ہونے کے طاعات ہیں۔ لیکن اگر آپ تشبہ کو معصیت مانتے ہیں تو پھر آپ کی اس عبارت کو حل کرنے سے ہم قاصر ہیں کہ مسلمان رہکر خواہ کسی قوم سے تشبہ کرے خواہ وہ شعائر دینی ہی میں ہو کوئی حرج نہیں۔ کیا ممنوعات شرعیہ اور قبائح دینیہ کا ارتکاب آپ کے نزدیک اچھا ہوا یا مستحسن فعل ہوتا۔ اگر ایسا تھا اور اسکے ارتکاب میں کوئی حرج نہ تھا تو پھر آخر شریعت کو انکے ممنوع قرار دینے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ کیا محض ان دو نقیضوں کے جمع کر دینے ہی کی ضرورت تھی کہ لوگ [illegible] ممنوع کے کر لینے میں کوئی حرج بھی خیال نہ کریں۔

ممکن ہے کہ آپ کی کوئی اصطلاح ہو کہ ممنوعات شرعیہ تو لا بس کے درجہ میں ہوں

اور واجبات شرعیہ فی نفسہٖ کے دائرہ میں۔

بہر حال نکتہ چینیوں کا یہ اصول کہ منہی عنہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو کفر ہو۔ سر تا سر غلط اور نہ صرف غلط بلکہ دائرہ اسلام میں ایک نا قابل تلافی فتنہ پردازی ہے۔ بندوں کو خدا پر جری کرنا اور صغائر و کبائر کی چراگاہوں میں آزاد چھوڑ دینا ہے۔ پس بقول سید صاحب کے اگر دھوتی باندھنے یا گھی پر چڑھنے یا عام مشابہت کفار پیدا کر لینے سے وہ کافر نہیں ہو سکتے تو بقول ہمارے یہ امور جائز بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ کسی چیز کے ممنوع ہونے کے لئے کفر ہی ہونا ضروری نہیں ہے۔

۳

ظاہری اعمال کا باطنی کیفیات پر اثر

نکتہ چینیوں کے شبہ کا دوسرا جزو یہ کہ ان ظاہری اوضاع و اطوار کو باطنی حقائق سے کوئی تعلق نہیں اگر ایک مسلمان سر سے پیر تک نصرانی صورت اور یہودی ہیئت بنجائے تو کیا اسکے اعتراف توحید و رسالت میں کوئی فرق آجائیگا۔؟ کبھی نہیں کیونکہ یہ اعتراف قلب سے متعلق ہے اور یہ اوضاع و اطوار کے تغیرات محض ظاہر سے جنکا قلب سے کوئی واسطہ نہیں۔ پھر اس ظاہری تشبہ بالکفار پر کیوں خواہمخواہ لے دے مچائی جائے اور اسکو معصیۃ شرعیہ پکارا جائے۔

ظواہر کا مسخ ہو جانا بھی بدترین عیب ہے

(۱) ہم تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اس ظاہری تغیر تبدل سے اسلام کی روح کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اور کسی طرح تشبہ بالاقوام سے اسلام کی حقیقت (ایمان) فنا نہیں ہو جاتی۔ لیکن اگر حقیقت باقی رہتے ہوئے بھی ہیئت بگڑ جائے تو کیا یہ ظاہری صورت کا بگڑ جانا کچھ کم عیب شمار کیا جاتا ہے؟ اور کیا دنیا اپنے ظاہر کو آراستہ کرنے اور نمائش کا ہر اچھے سے اچھا

پہلو اختیار کرنے میں کوشاں نہیں رہتی؟ پھر غریب اسلام ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ ان حقوق سے محروم کردیا جائے۔ اور اس کی تمام ظاہری اوضاع کو یک قلم مٹا دینے کی سعی بیہودہ کیجئے۔

کیا کوئی دیوانہ اور سڑی بھی یہ گوارا کرسکتا ہے کہ چونکہ جسم کی بدنمائی اور ظاہر کی بدزینتی سے روح پرواز نہیں کر جاتی۔ اسلئے اپنے یا اپنے کسی محبوب کے چہرے پر سیاہی مل دیجئے، چند اعضا کو کاٹ تراش دیجئے بدن پر جگہ جگہ داغ دیجئے اور زخم ڈال دیجئے، یہی کوئی ہاک نہیں ہے، اور اسپر قناعت کرکے بیٹھ جائیے کہ روح موجود اور زندگی باقی ہے۔

پس اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ ظاہری تشابہ کا کوئی اثر باطن تک نہیں پہونچتا، تب بھی ظاہری تشبہ کے آثار کم از کم ظاہری پر ایسے بدنما پڑتے ہیں کہ ان کے لئے کوئی تلافی و تدارک نہیں اور کسی چیز کی محض صورت جسمانی کا مسخ ہوجانا بھی کوئی کم عیب نہیں۔

ایک لنگڑا۔ لنجا۔ اندھا۔ مقطوع الاطراف، اور دنیا بھر کا بھی انسان انہی باوجود عیوب سے پُر اور عاجز و بیکار ہونے کے انسان بھی پکارا جاتا اور زندہ بھی رہتا ہے۔ لیکن کیا آپ اس کیلئے ایسی زندگی پسند کرتے ہیں یا اپنے لئے صرف ایسی ہی زندگی پر بخوشی قناعت کرسکتے ہیں؟ نہیں تو پھر اسلام کے لئے اس عاجزانہ اور ادھوری زندگی پر قانع بنانے کا داعیہ آخر آپ نے کہاں سے پیدا کرلیا؟ اور کسطرح دانشمندوں کی عقلوں نے گوارہ کیا کہ وہ دین کے ایک حصے (ایمان قلبی) پر قناعت کرکے دوسرے حصے (اسلام ظاہری) کو برباد چھوڑدیں۔

حالانکہ یہ ظاہر و باطن یا اسلام و ایمان ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں جن میں سے نہ تو کسی ایک پر قناعت ہی کیجا سکتی ہے۔ اور نہ ایک کے بغیر دوسرا باقی ہی رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ ابن شاہین نے علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ۔

الایمان والاسلام قرینان لا یصلح واحد منھما الا مع صاحبہ (کنز العمال)	ایمان اور اسلام دو ساتھی ہیں جن کوئی ایک بغیر دوسرے کے بحال نہیں رہ سکتا۔

نیز ایک حصہ دین (ایمان) کو لے لینا اور ایک حصہ دین (اسلام) کو ترک کردینا قطع نظر

ان حصول کی بقاء وعدم بقا کے یہ تو یہودیت کا وہی شیوۂ ایمان بالبعض وکفر بالبعض ہوگا۔ جسکے ایمان کو بھی قرآن نے کفر ہی کہا ہے۔

ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذٰلک سبیلا اولٰئک ھم الکٰفرون حقا۔ نعوذ باللہ منہ۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض باتوں کو مانتے ہیں اور بعض کے منکر ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان وکفر کے درمیان ایک راستہ نیا بنالیں۔ وہ بلا شبہ کافر ہیں۔

یہ بحث صرف اس تقدیر پر تھی کہ ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے نکتہ چینوں کی طرح مان لیں کہ یہ ظاہری تغیرات باطن پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ لیکن اب ہم اس بالفرض سے آگے بڑھکر وہی کہتے ہیں جو حقیقت ہے اور جسکو پیش نظر رکھکر ہی شریعت نے ظاہری مشابہتوں کی ممانعت کی ہے۔

ظواہر کی تاثیرات بواطن پر

(۳) اور وہ یہ کہ شرعیات ہی میں نہیں بلکہ کائنات کے ہر ایک محسوس ذرے میں ظاہری پیرائے اور پھر اُن ظاہری پیرایوں کی حرکات وسکنات بواطن میں اچھا اور بُرا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ اگر پیرایوں پر کوئی تعمیری عمل کیا جائیگا تو حقائق تعمیری اثر قبول کرلیں گی اور اگر تخریبی عمل ہوگا تو حقائق بھی تخریب کا ہی اثر لے لینگی۔

کیونکہ یہ دنیا نہ تو محض معانی وحقائق کا عالم ہے کہ اسمیں حقائق وارواح بغیر پیرایوں اور اجسام کے تھم سکیں۔ اور نہ محض اجسام وصُور ہی کا عالم ہے کہ اس میں اجسام بغیر ارواح کے باقی رہجائیں۔ بلکہ رُوح وجسم۔ ظاہر وباطن اور حقیقت وہیئت سے ترکیب دیکر اس کائنات کو استوار کیا گیا ہے۔

پھر اس مرکب کائنات کے صناع نے اپنی بے پایاں حکمت سے اجسام کو تو محل سپرد کیا اور ارواح میں قوتیں ودیعت کئے یعنی ارواح کو تو مصادر اعمال کا مخزن بنادیا اور اجسام کو مظاہر اعمال کا۔ اور پھر چونسبتہ رُوح وجسم میں قائم کی تھی وہی بعینہ رُوحانی ملکات واور

جسمانی اعمال میں قائم فرمادی یعنی جس طرح رُوح اپنے قیام میں جسم کی محتاج تھی اور جسم اپنی بقاء میں رُوح کا بعینہٖ اسیطرح اخلاق واعمال میں ایک رشتہ ارتباط قائم کیا کہ اخلاق وملکات اپنے قیام واستحکام اور رسوخ میں اعمال کے محتاج ہیں اور اعمال اپنے وجود وظہور اور بقاء کی میں اخلاق کے دستنگر ہیں۔

پس اگر روحانی قویٰ وملکات نہوں تو اعمال بجائے اپنی نمائش کرنے کے پردۂ عدم میں مستور رہجائیں اور اگر اعمال کا ظہور اور تتابع نہو تو اخلاق وملکات اور روحانی استعدادیں بجائے راسخ و مستحکم ہونے کے زائل ہونے لگیں۔

پس اس سے یہ نتیجہ واضح طور پر نمایاں ہوگیا کہ رُوح تو اپنے باطنی قویٰ سے وجود کا اثر ڈالتی ہے اور اجسام اپنے ظاہری اعمال سے ان روحانی قویٰ پر رسوخ واستحکام کا۔ اور پھر اس نتیجہ سے ایک اور نتیجہ یہ بھی کھل گیا کہ اگر جوارح سے خوشنما اعمال سرزد ہوں تو رُوح پر بہترین آثار ڈالیں گے اور اگر بدنما اور مسخ شدہ اعمال صادر ہوں تو رُوح پر بدترین آثار ڈالیں گے۔ اور اسطرح پیرایوں کی خوشنمائی وبدنمائی اور تعمیر وتخریب روح تک نیک وبد اور آبادی وبربادی کے آثار پہونچاتی رہیگی۔

غرض روح وجسم یا اخلاق واعمال میں جانبین سے تاثیر وتاثر کا ایک سلسلہ قائم ہے جس سے کوئی نامی اور ذی رُوح مخلوق نباتات ہوں یا حیوانات پھر کائنات کی عام موجودات اعیان ہوں یا اعراض مستثنیٰ نہیں ہیں۔

تاثیرات ظاہر محسوسات میں

مثال کے طور پر پہلے نباتات ہی کو لے لو۔ پھولوں کی معنویت (خوشبو) اُن کے اوراق اور نازک پتیوں پر متعدد ہے۔ اگر گلاب یا یاسمن کی ان ست رنگ سپید پنکھڑیوں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے تو یقیناً اُن کی خوشبو بھی منتشر ہوکر معدوم ہو جائیگی۔ حالانکہ یہ قطع وبرید خوشبو پر نہیں واقع ہوئی بلکہ پتیوں پر لیکن پھر بھی پیرایہ کے تغیر سے حقیقت کیسقدر جلد

متغیر ہو گئی۔

خود انسان ہی میں دیکھ لو کہ مثلاً اس کی نگاہ کی لطیف طاقت آنکھ کے پردہ میں کارفرما ہے اور سماعت کی قوت پردۂ گوش میں اگر حدقۂ چشم یا پردۂ گوش کو توڑ پھوڑ دیا جائے تو کیا یہ باطنی قوتیں بصارت و سماعت باقی رہ سکتے ہیں۔ یا اگر پورے جسم کو پاش پاش کر دیا جائے تو کیا روح اور زندگی پھر بھی قائم رہ سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! حالانکہ یہ تمام تغیرات ظواہر پر کئے گئے تھے نہ کہ براہِ راست بواطن پر۔ لیکن پھر بھی ان ظواہر کا تغیر بواطن تک کس سرعت کے ساتھ پہونچ گیا اور پھر کیسی مطابقت کے ساتھ پہونچا کہ جس درجہ پیرائے متاثر ہوئے اسی درجہ میں حقائق بھی متاثر ہو گئیں یہاں تک کہ اب یہ بھی کسی کے بس میں نہ رہا کہ اگر بینائی کی طاقت کا خانۂ ظہور ویران ہو گیا تھا تو اسے ہاتھ پاؤں یا بدن کے کسی اور گوشہ ہی میں جگہ دیکر ٹھیرا لیا جائے۔

اسی طرح علوم اور اعراض کے سلسلہ پر نگاہ ڈالو تو وہاں بھی اس تاثیر و تاثر کا سلسلہ کھلا ہوا نظر آئیگا۔ ایک فصیح و بلیغ عبارۃ کی معنویت اس کے الفاظ میں پنہاں رہتی ہے۔ اگر الفاظ کو مسخ کر دیا جائے یا تعبیرات بدل دی جائیں تو ان الفاظ کے ساتھ ساتھ وہ معانی بھی رخصت ہو جائینگے جو ان الفاظ کی قباؤں میں جلوہ آرا تھے حالانکہ یہ محو و ثبات صرف عالم الفاظ میں کیا گیا تھا نہ کہ معانی میں۔ مگر معانی کا قیام ہی جبکہ ان الفاظ کے پیرایوں کی بدولت تھا تو پیرایہ مٹتے ہی وہ بھی رخصت ہو گئے۔

پھر بھی الفاظ یعنی معانی کے ظاہری پیرائے جو نوک زبان سے ادا کئے جاتے ہیں انسانی ارواح میں اس درجہ مؤثر ہیں کہ شاید تیر و تفنگ کے گہرے زخم بھی ایسی تاثیرات پیدا نہ کر سکیں۔ اگر کسی کو گالی دیدی جائے تو محض اس ایک لفظ کی بدولت جو ممکن ہے کہ محض غلط ہی کہا گیا ہو مخاطب کا خون جوش کھانے لگتا ہے اور اس کے نفس میں ایک زبردست انقلاب ہیجان رونما ہو جاتا ہے۔

جراحات السنان لها التیام	ولا یلتام ما جرح اللسان

اور کسی جوش میں بھڑکے ہوئے انسان کے کانوں تک چند نرم اور مہذب الفاظ خلیقانہ اور متواضعانہ
لہجہ سے پہونچادیے جائیں تو پھر دیکھو کہ کسی آن اس کا جوش کس طرح ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

اگر ظواہر اپنے بواطن تک آثار نہیں پہونچاتے اور اگر عالم الفاظ عالم معانی میں موثر نہیں اور اعمال
کی کوئی تاثیر اخلاق پر نہیں تو پھر آخر یہ انقلابات کیا ہیں؟ یہ فنا و بقاء حقائق کیا معنی رکھتی ہے؟ اور
ارواح میں ہیجان و سکون اور تموج و تلاطم کیسا ہے؟۔

پھر کیا نکتہ چینوں نے کبھی اپنے احساس کا مشاہدہ نہیں کیا کہ اگر غسل کے ذریعہ بدن کو صاف
ستھرا کیا جائے تو روح بشاشت کے آثار قبول کر لیتی ہے اور مکدر اور گندہ رکھا جائے تو روح تک بھی
یہی تکدر سرایت کرنے لگتا ہے۔ اگر صاف ستھرے کپڑے ہوں تو روح میں انبساط کی کیفیات جوشزن
ہونے لگتی ہیں۔ اور اگر میلے کچیلے کپڑے ہوں تو روح میں انقباض کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔
اگر کپڑوں پر عطریات چھڑکے ہوئے ہوں تو روح میں مسرت و شادمانی کے جذبات ابھرنے لگتے
ہیں اور اگر نجاسات لگی ہوئی ہوں تو اس میں تکدر و بے چینی کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔

حالانکہ مادیات و روحانیات میں ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے بون بعید بلکہ تضاد کی
نسبت ہے لیکن پھر بھی اس قدرتی جوڑ و اتصال کے سبب یہ روحانیات اپنی اضداد سے آثار قبول
کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، اور فطرۃً جسم کی طہارت و نجاست سے خود متاثر ہونے لگتی ہیں۔

تو پھر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ بدن اور کپڑوں پر اگر معنوی نجاست و کثافت یا معنوی لطافت
و پاکیزگی سرایت کر جائے تو اس معنوی اشتراک کے سبب روح اور بھی زیادہ اس لطافت و کثافت
معنوی سے متاثر ہو اور ایسے ہی لطیف و کثیف آثار قبول کرے جیسے اس کے بدن و لباس نے
قبول کئے تھے۔

[illegible] ہر [illegible] شخص کے نزدیک جو دیدۂ بینا و اسکے ساتھ چشم بصیرت رکھتا ہو۔
[illegible] سے کہ بدن [illegible] کی معنوی [illegible] اگر وہ [illegible] اور [illegible] ہو سکے
[illegible] شخص کی [illegible] ہوں۔ اور جن [illegible] کا [illegible] نہ کیا گیا ہو جو

مرضی الٰہی و پسندیدۂ بارگاہ رسالت پناہی ہے۔ اور اسیطرح بدن لباس کی معنوی لطافت یعنی وہ اوضاع و اطوار جنکا تجمل و تزین سنت کے موافق اور حدود شرعیہ کے دائرہ میں ہو پنہان معنوی تاثیرات قلب تک سرایت کرتی ہو اور قلب وہی کیفیات قبول کرلے جو اس ظاہری قالب نے قبول کی تھے

ہمارا مدعیٰ اور تجربیات

چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ انسانی تجمل و تزین کی مختلف لباسی اور بدنی شکلیں اور وضع و تراش کی متنوع ہیئتیں خود اسی انسان کے باطن پر موثر ہو کر اُسے بناتی اور بگاڑتی رہتی اور اس کے اخلاق باطنی میں کھلا ہوا انقلاب پیدا کرتی رہتی ہیں

اگر ایک جوانمرد اور بہادر انسان نازک لباس تیتلی بہاز یورات اور غیر معمولی ناز و تنعم کی ہیئتیں اختیار کرلیتا اور اپنے ظاہری وجود کو مزین بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے تو چند ہی دن کے بعد اس جوانمردی و دل آوری اور جفاکشی کے بجائے اس کا باطنی عالم (قلب) بزدلی و تن آسانی اور آرائش و عیش پسندی کے نسوانی جذبات کو قبول کرنے لگتا ہے وہ اُس کے تمام شجاعانہ جذبات خاک میں ملجاتے ہیں اور جس طرح اُس نے اپنے ظاہر کو نسوانی اعمال کا زیر مشق بنایا تھا اسی طرح اُسکا باطن بھی انہی نسوانی جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔

اسیطرح ایک انسان اگر بتکلف امراء کا لباس اختیار کرتا ہے تو اس لباس کے تمام لوازم تجبر و تفاخر یا تحقیر ناس وغیرہ اسکے قلب میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اگر فقراء و مساکین کی ہیئت اختیار کرتا ہے تو اس زی و ہیئت کے لوازم فقر و تواضع اور خاکساری و فروتنی اسکے باطن کو رنگ دیتے ہیں اگر علماء و مشائخ کی طرز و وضع ظاہر پر چسپت کرتا ہے۔ تو اس کے آثار ورع و تقویٰ اور حیاء و تدین سے اُسکا باطنی جہان روشن ہو جاتا ہے اور اگر سفیہوں بیوقوفوں یا شاطروں کا لباس اختیار کرتا ہے تو پھر یقیناً چالاکی و عیاری اور مفسدہ پردازی وغیرہ کے جذبات قلب میں رسوخ پیدا کرلیتے ہیں اور اس سے اسی قسم کے اعمال کا عادۃً ظہور پذیر ہونا بعید نہیں رہتا۔

سخت حیرت ہے نکتہ چینوں پر کہ ظواہر کی یہ قطعی اور واقعی تاثیرات جب اُن کے سامنے آتی

ہیں تو وہ اس حیثیت سے تو انہیں بلا چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ ان کے عینی مشاہدات ہیں لیکن اس حیثیت سے وہ ان تمام مشاہدات کو رد کر ڈالتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے تشریعی حیثیت سے بھی انہیں اسی طرح تسلیم کر لیا ہو گویا ان کو اپنی آنکھ پر اس سے بھی زیادہ اعتماد ہے کہ جتنا انکو خدا کی رسالت اور اخبار وحی پر ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ ایمان صرف اسی اقرار و اعتراف کا نام تھا جو محض انبیاء علیہم السلام اور وحی الٰہی کے اعتماد و یقین پر کیا جائے اور دنیا کے سارے مشاہدات سے کہیں بڑھ کر اسے قطعی اور واقعی سمجھا جائے۔ بہرحال وہ مانیں یا نہ مانیں لیکن شریعت ان مشاہدات سے زیادہ اور کیا کہتی ہے؟ اور اس کا دعویٰ اسکے سوا کیا ہے کہ یہ ظاہری افعال کی تکرار اور ان کا بار بار دھرانا قلوب میں ایک ملکۂ نفسانیہ کے راسخ ہونے کا سبب بن جاتا ہے اگر ایک شخص خیر کے افعال کا بار بار اعادہ و تکرار کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ اس کے قلب میں خیر کے ملکات اور نورانی آثار راسخ ہو جائیں۔ اور اگر شر کی ارتکاب کی عادت ڈال رہا ہے تو قلب میں شر کے ظلمانی اور ظلمانی آثار پیدا ہو جائیں خواہ یہ ظاہری افعال تدین کے متعلق ہوں یا تمدن کے دینی امور ہوں یا معاشرتی۔

شرعیات اور تاثیر ظاہر

نیز اسی سلسلہ میں شریعت نے تصریحات کی ہیں کہ جوارح کے اعمال، لباس کی انواع اور کپڑوں کی اقسام ایمان کی کیفیات پر زیادتی اور کمی کا اثر ڈالتی ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ صوف سوا پہننا جو محض ایک ظاہری فعل ہے ایمان کی حلاوت پیدا کر دیتا ہے جو محض ایک باطنی کیفیت ہے

من سره أن يجد حلاوة الإيمان فليلبس الصوف۔ (كنز العمال)	جس کو ایمان کی حلاوت پسند ہو اسے چاہیے کہ صوف پہنے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ عمامہ باندھنے سے حلم اور وقار کی کیفیت قلب میں پیدا ہو جاتی ہے:

اعتموا تزدادوا حلما۔ (كنز العمال)	عمامہ باندھا کرو حلم بڑھ جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ نمازوں میں صفیں سیدھی رکھو گے تو قلوب میں بھی راستی و استقامت

پیدا ہوجائیگی ورنہ کجی واختلاف۔

استووا تستوِ قلوبکم ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم۔	اصلوٰۃ میں سیدھے رہو تو تمہارے قلوب سیدھے رہینگے، آگے پیچھے مت ہو ورنہ قلوب بھی اسی طرح آگے پیچھے اور متفرق ہوجائیں گے۔

حدیث میں خبر دی گئی کہ اگر علم پر جوارح سے عمل کروگے تو قلوب میں نئے نئے علوم پیدا ہوجائیں گے۔

من عمل بما علم ورثہ اللّٰہ علم مالم یعلم	جو اپنے علم پر عمل کریگا تو خدا تعالیٰ اسے ایسے علم کا وارث بنائیگا جسکو ابتک وہ نہیں جانتا تھا۔

پھر جس طرح یہ اعمال اچھی تاثیرات سے خیر کی حقیقت قلوب تک پہونچا دیتے ہیں۔ اسیطرح اعمال شر شر کی حقیقتیں قلب میں پیدا کردیتے ہیں۔

قرآن کریم نے خبر دی کہ بد اعمال لوگوں کے قلوب میں بدعملی کے سبب ایک زنگ بیٹھ جاتا ہے جو قبول حق کی استعداد کو آخرکار فنا کردیتا ہے جسکو کہیں طبع سے کہیں رَین سے کہیں ختم سے کہیں وقر سے کہیں کنان سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

ایک جگہ فرمایا

کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون۔	ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

کہیں فرمایا۔

بل طبع اللّٰہ علیھا بکفرھم۔	بلکہ خدا نے ان کے قلوب پر مُہر کردی ان کے کافرانہ اعمال کے سبب۔

اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا

ایاکم والمحقرات من الذنوب فان الذنب علی الذنب یوقد علی صاحبہ جحیما ضخمۃ۔	چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہت بچو کیونکہ گناہ پر گناہ کرتا رہتا اس گنہگار پر ایک عظیم الشان آگ روشن کردیتا ہے۔

یعنی صغائر سے کبائر پر جرأت ہوتی ہے اور کبائر سے استخفاف معاصی اور کفر پھر اور یہی آگ کا پیش خیمہ ہے۔

مجاہد کہتے ہیں کہ۔

القلب کالکف فاذا اذنب الذنب انقبض واذا اذنب ذنبا اخر انقبض ثم یطبع علیہ وھو الرین ۔	قلب مثل کف دست کے کھلا ہوا ہے یعنی منشرح ہے جب گناہ کیا جاتا ہے تو سکڑ جاتا ہے پھر کیا جائے تو اور سکڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر اس پر مہر کر دی جاتی ہے اور

یہی زنگ ہے۔ یعنی قبول حق کی استعداد بھی باقی نہیں رہتی۔

اسی لئے حدیث ابی ہریرۃؓ میں فرمایا گیا کہ۔

اذا اذنب الانسان حصلت فی قلبہ نکتۃ سوداء حتی یسود القلب ۔	جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے جوں جوں وہ عمل کرتا رہتا ہے یہ ظلمانی

نقطہ بھی بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ آخرکار قلب سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گناہ بکردار داخلی قوی ہو جاتے ہیں اور توبہ کی توفیق مسدود۔

بہرحال جس طرح پہلی نوع کی احادیث نے قلوب میں ایمانی کیفیات، ایمانی اخلاق راسخ ہونے کا سبب اعمال کو بتایا تھا۔ اسی طرح ان آیات و احادیث نے قلوب کے زنگ کفر اور بے توفیقی کا سبب بھی انسانی عمل اور کسب ہی کو بتایا ہے۔ اور ان دونوں قسم کے سلسلوں سے شریعت اسلام کا یہ دعویٰ بالکل پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ ہر ظاہری عمل کا اثر قلب پر پڑتا ہے۔

مسئلہ تاثیر ظاہر دنیا کا عمومی مسئلہ ہے

پھر یہ ظاہر عمل کی تاثیر کا دعویٰ ایک اسلام ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ تمام مذاہب اس کے ساتھ ہم دعوی ہیں متفق اللسان ہیں نہیں بلکہ تمام مذاہب کی تعمیر ہی محض اسی ایک اصول تاثیر ظاہر فی الباطن پر کھڑی ہوئی ہیں۔ کیونکہ تمام مذاہب کا مقصد روح کی ترقی ہے۔ اور یہ ترقی اعمال کے سوا ناممکن ہے کیونکہ محض احوال و کیفیات سے تو روح پہلے ہی سرشار تھی ہاں اسمیں اعمال کا وجود نہ تھا اس عمل کرنے اور ان باطنی قوی کو بروئے کار لانے کے لئے ہی روح کو جسم کا

جامہ عطا ہوا۔ تاکہ ان اعمال کے ذریعہ رُوح میں اُن اعمال کے مناسب ملکات راسخ اور متمکن ہوجائیں اور ظاہر ہے کہ عمل کا تعلق جسم سے ہے نہ کہ رُوح سے۔

اسی لئے تمام مذاہب نے اپنا مقصد ترقی رُوح ظاہر کر کے جسقدر بھی اعمال اس مقصد کی تحصیل کے لئے بتلائے ان سب میں بجائے رُوح کے جسم کو مقید کیا گیا ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ پھر معاشرۃ و تمدن کی تمام جزئیات اور بسلسلۂ معاملات کے تمام ہی احکام جو کرنے اور نہ کرنے کے متعلق ہیں سب ہی اجسام پر جاری کئے گئے ہیں نہ کہ براہ راست رُوح پر۔

پس اگر اس ظاہر اجسام کی عملی قید و بند کو دیکھکر یہ کہدیا جائے کہ شرائع کا مقصد محض ان اعضا جسم ہی کا پابند کرنا ہو اور یعنی رُوح اور ترقی رُوح سے ان شرائع کو کوئی بھی تعلق نہیں تو پھر سوال یہ ہو کہ تزکیۂ رُوح اور ترقی باطن کو کہاں تلاش کیا جائے جبکہ مذاہب بھی اس مقصد سے خالی رہ گئے۔ اور اگر مذاہب کا اعلیٰ مقصد تزکیۂ رُوح یا ترقی باطن ہی تسلیم کر لیا جائے جیسا واقعہ بھی یونہی ہے، تو سوال یہ ہے کہ پھر ان مذاہب نے اعمال کی قید و بند میں ان بیچارے اعضاء جسم کو کیوں مقید کر دیا؟۔

اس مشکل سوال کا حل اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم مذاہب کا مقصد ترقی رُوح اور اُسکی تحصیل کا ذریعہ اعمال بدن رکھکر بلا چون و چرا تسلیم کریں کہ جسم و رُوح میں ضرور کسی تاثیر و تاثر کا سلسلہ قائم ہے۔ اور یہ کہ ہمارے جسم کے حرکات و سکنات براہ راست رُوح پر اپنا اثر ڈالتے ہیں تاکہ اعمال شرائع کے ذریعہ روحانی ترقی بجائے خود باقی رہ سکے۔ ورنہ اگر اعمال کا اثر باطن پر تسلیم نہ کیا جائے تو تمام مذاہب کی تعمیریں بیک آن منہدم ہو جاتی ہیں اور انسان کا دنیا میں آنا اور آکر کچھ کرنا محض لغو اور بے سود اور عبث ٹھہر جاتا ہے۔

پس بجائے اس کے نکتہ چینوں کے کسی بے جڑ وسوسہ سے تمام شرائع الٰہی کا انہدام جائز تصور کیا جائے۔ یہ زیادہ معقول ہو کہ اس وسوسہ ہی کو نامعقول اور مردود کہدیا جائے۔

پس اب اسلام بلکہ دنیا کے سارے ہی مذاہب کو اُن لایعقل افراد پر خندہ زنی کا موقع

ہے جو اپنی آزادیٔ رائے اور بے قیدی سے مغلوب ہو کر کہا کرتے ہیں کہ۔

"اگر ہم نے فلاں لباس پہن لیا یا فلاں کام کر لیا یا کچھ جزوی فروگذاشتیں ظاہری طور پر کر لیں تو کیا ہمارے ایمان پر اثر پڑ جائیگا؟" ان سے خدا کا امر اور اس کا خلق یعنی حق تعالیٰ کی تشریع اور اسکی تکوین متفقانہ اقرار کرا دیگی کہ ظواہر اعمال اور برائیوں کا اثر باطن میں ایمانی آثار بھی پیدا کر سکتا ہے اور کفری بھی اور وہ ایمان کو بھی قدرے محو کر سکتا ہے اور کفر کو بھی اور اس لئے ایسے خفیف الدماغ انسانوں کا یہ کہنا کہ ظاہر کا اثر باطن میں نہیں پہونچ سکتا خدا کے خلق و امر دونوں کی تکذیب اور مذہبی دنیا کی حجت کا مقابلہ ہے۔

تاریخی شواہد سے مسئلہ کا اثبات

ان اصولی اور عملی تصریحات کے بعد اگر تاریخ عالم کے واقعات و مشاہدات پر ایک نگاہ ڈال لیجائے تو ان ظواہر کی تاثیرات پر تاریخی واقعات بھی شہادت دیں گے۔ اور معلوم ہوگا کہ جب کبھی فرد یا قوم نے ظاہر عمل سے کسی خیر کا کسب کیا اگر خیر کی نیت بھی نہ ہو تو آخرکار اس کے قلب میں خیر پیدا ہو کر رہی۔ اور جب کسی نے اپنے عمل سے شر اور برائی کی صورت اختیار کی تو گو نیتہً شر کی نہ ہو تب بھی قلب میں شر پیدا ہو کر رہی۔

(۱) پہلی فصول میں عمرو بن لحی بن قمعہ ابن خندف کا ذکر آچکا ہے کہ اس نے [illegible] کے بت پرستوں کی مشابہت میں خود ہی بیت اللہ میں بت نصب کئے، وہ گو اس وقت شرک کی نیت بھی [illegible] بلکہ شاید نظر کی یکسوئی اور دل کی یکرخی کے لئے ان بتوں کا استعمال کیا گیا تھا لیکن بہرحال چونکہ یہ عمل ہی فی نفسہ شرک کا تھا تو انجام کار اہل عرب کے قلوب شرک اور بت پرستی سے ملوث ہو گئے اور مذہب توحید اور ملت ابراہیم کے نور سے یکسر محروم کر دئے گئے۔ قالبوں نے جب شر کا عمل اختیار کیا قلوب نے بھی اسی شر کے آثار قبول کر لئے۔

(۲) صاحب مرقاۃ شارح مشکوٰۃ لکھتے ہیں کہ [illegible] خدا کے حکم و مشیت سے متعلق ہے کہ ہدایت و ضلالت اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے لیکن عالم اسباب [illegible]

چیز نے ان کے قلوب میں استعداد پیدا کر دی وہ اُن کا ظاہری تشبہ تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے لباس سے انہوں نے کیا اور ویسا ہی جبہ و دستار پہنکر میدان مقابلہ میں آئے۔ گویا اپنے ظاہر کو تو انہوں نے پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کے تابع بنا لیا تھا اور ظاہر اً اور رسماً اُن میں اور موسیٰ علیہ السلام میں بُعد و منافرت باقی نہ رہی تھی۔ آخر کار باطن بھی تابع ہو گیا اور قلبی منافرۃ بھی اُٹھ گئی جو ایمان کا ذریعہ بن گئی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ پر وہ کہہ سکتے تھے کہ موسیٰ بڑے ساحر ہیں اور ہم چھوٹے اسلئے اُن کا غلبہ دلیل صداقت نہیں بلکہ دلیل کمال فن ہے۔

(۳) پھر لکھتے ہیں کہ فرعون کے دربار کے ایک مسخرہ کو (جو موسیٰ علیہ السلام کی نقلیں اُتارا کرتا تھا اُن جیسا لباس پہنکر اُن جیسی عصا ہاتھ میں لیکر اُن کیسی آواز بنا کر فرعون اور فرعونیوں کو ہنسایا اور استہزاءً موسوی مقاصد کی تبلیغ کیا کرتا۔

جبکہ غرق سے اُسکو بچا لیا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں شکوہ کیا کہ اُسے کیوں بچا لیا گیا۔ حالانکہ سب سے زیادہ ایذا مجھے اُسی کے تمسخر سے پہونچتی تھی۔ تو جواب دیا گیا کہ یہ بیشک تمسخر سے ایذا دیتا تھا اور اس کا قلب کفر ہی سے پُر بھی تھا لیکن تیری لباس جیسا لباس پہنتا تھا۔ تیری طرز تکلم جیسا طرز تکلم اختیار کرتا تھا اور تیری تمام اداؤں سے اس نے ظاہری مشابہت پیدا کر لی تھی! پس ایک حبیب سے بعید تھا کہ دشمن کو حبیب کی زی و ہیئت میں عذاب دے۔ اسلئے اگر اس نے دنیا میں ظاہری طور پر تیری صورت سے تشبہ کیا تو صرف دنیا میں ظاہری طور پر ہی اُسے نجات دیدی گئی کہ غرق بحر سے بچا لیا گیا۔ ہاں اس کا قلب کفر سے لبریز ہے۔ اسلئے اُسکی آخرۃ بھی عذاب سے لبریز ہے۔

(۴) اور اب اس اُمت میں بھی دیکھ لو کہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کا ایمان بھی اسی ظاہری کی اثر اندازی کا رہین منت ہے۔ جنگ حنین سے واپس آتا ہوا لشکر اسلامی راستہ میں کسی پڑاؤ پر فروکش تھا۔ گاؤں کے لڑکے لشکر اسلامی کو دیکھنے کیلئے تماشائی بنکر بہجوم کر آئے۔ جب لشکر میں اذان ہوئی تو تمام لڑکے استہزاء سے نقلیں اُتارنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان لڑکوں کو

پکڑ لاؤ۔ چنانچہ پکڑ کر حاضر کئے گئے۔ پوچھا گیا کہ کون نقل اُتارتا تھا۔ سب نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ اسلئے سب لڑکے رہا کر دیئے گئے اور ابو محذورہ کو اُن کی نیک نصیبی نے روک لیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کھڑے ہو۔ اور اذان کہو اور اذان کی نقل اُتارو۔ یہ کھڑے ہوئے اور جیسے جیسے آپ اذان تلقین فرماتے گئے وہ بتکلف اور بجبر زبان سے ادا کرتے رہے۔ یہانتک کہ اسی زبان سے توحید و رسالت کی وہ شہادت بھی ادا کی جس کی وجہ سے تمام عرب میں ایک تلاطم بپا تھا۔ لیکن سبحان اللہ کہ اس ظاہری حرکت لسانی نے ابو محذورہ کے قلب کو محروم نہ چھوڑا۔ بلکہ وہی توحید و رسالت کی شہادت جو زبان سے بتکلف ادا کرائی گئی بالآخر سویدائے قلب میں پیوست ہو کر رہی۔ اور پھر آپ دیکھتے ہیں کہ ابو محذورہ کس جلالت کے آسمان کا ایک درخشندہ ستارہ ہیں۔

اور اسی حدیث سے بداہتہً یہ بھی نکل آیا کہ نبوت کے آثار لطیفہ اگر قلوب میں پہنچ سکتے ہیں تو زبان کی شہادت اور ظاہر کے متاثر کرنے ہی سے پہنچ سکتے ہیں کیونکہ کسی باطن میں جب ایسی چیز پہنچائی جائیگی جو اس میں نہیں ہے تو اس کا راستہ یہی ہے کہ ظاہر کے راستہ سے اُسے قبول کیا جائے قلوب کے عالم کا مظہر لسان اور جوارح ہی ہیں تو جو بھی آثار ظاہر پر ڈال لئے جاویں گے وہی آثار باطن کو بھی متاثر کر دیں گے۔

چوں بیاری طہارت ظاہر	باطنت نیز حق کند طاہر

اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا۔

اسلم ولو کنت کارھًا۔ | اسلام لے آؤ گرچہ ابتداءً اس سے کراہت بھی ہو۔

کیونکہ انجام کار یہ ظاہری اسلام ہی باطن کو رنگ دیتا ہے۔

ہمہ دین و ہمہ دنیا و ہمہ نام | [illegible]

اسی اصول پر حدیث میں خشوع و خضوع حاصل کرنے اور حق تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کا داعیہ پیدا کرنے کی ترکیب بتلائی گئی کہ۔

فان لم تبکوا فتباکوا۔ | اگر تم رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنالو یعنی بتکلف۔ رونے کی صورت بنا لینے سے گریہ کی حقیقت

انقلاب میں پیدا ہو جائے گی۔

اور ٹھیک اسی اصول کو کہ ہر ظاہر اپنے باطن میں مؤثر ہے۔ ابو داؤد کی اس حدیث میں جسکو مردود ٹھیرانے میں نکتہ چینوں نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر دیا ہے ان کھلے الفاظ میں ادا فرمایا گیا ہے۔

من تشبہ بقوم فھو منھم۔ | جو کسی قوم سے ظاہری مشابہت پیدا کرے گا وہ انجام کار باطن بھی اسی قوم میں سے ہو جائیگا۔

بہرحال یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جب کبھی اسلام (ظاہر عمل) پر حملہ کیا جائیگا تو نہیں ہو سکتا کہ ایمان (باطنی حقیقت) اس سے متأثر نہ ہو اگر اسلامی اعمال کے پیرائے چھوڑ دیے جائیں تو بلاشبہ ان متروک پیرایوں کی حقیقتیں بھی نہ رہینگی اور دین کے اعضا یک قلم قلم کر دینے کے بعد اس کی ایمانی روح بھی خود بخود سمٹ جائے گی۔

پس یہ وسوسہ محض ایک نفسانی دھوکہ یا شیطانی نزغہ ہے کہ ظاہری اوضاع باطن پر مؤثر نہیں ہیں۔ جس کیلئے نہ کوئی شرعی حجت ہے نہ عقلی برہان۔

پس نکتہ چینوں کا یہ کہنا کہ حدیث من تشبہ بقوم روایۃً و درایۃً مردود ہے خود ہی عقلاً اور نقلاً مردود اور ناقابل التفات ہے۔ انھوں نے جو رد وطرد حدیث پر ڈالنا چاہا وہ الحمد للہ کہ انہیں کی طرف لوٹ گیا۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

ظاہری اعمال باطنی جذبات کے ترجمان ہیں

(۲۴) بحمد اللہ یہاں تک دلائل و نظائر سے ثابت ہو چکا ہے کہ تشبہ کے یہ ظاہری اعمال اپنی تاثیر باطن تک پہنچ جاتے اور قلوب میں متشبہانہ انقلاب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر اور زیادہ غائر نظر سے کام لیا جائے تو یہ نظر آئیگا کہ قلوب فی الحقیقت اس عملی تشبہ کی تاثیرات سے انقلاب قبول نہیں کرتے۔ بلکہ قلوب کے پہلی انقلاب کی وجہ سے اس عملی تشبہ کا جوارح پر ظہور ہوتا ہے۔ گو پھر یہی عملی تشبہ قلوب میں اس انقلاب و تبدیل کو قائم اور راسخ بھی بنا دیتا ہے۔ پس عملی

تشبہ تو صرف قلوب کے اُلٹ جانے کی ایک دلیل ہے جس سے قلبی انقلاب کا ثبوت ملجاتا ہی جو ایک ثانوی مرتبہ ہے۔ ورنہ قلوب ان اعمال کی اثر اندازی سے پیشتر ہی تشبہ کا انقلاب قبول کر چکے ہیں۔

کیونکہ ان اعمال کا قلب تک آثار پہونچانا اسپر موقوف ہو کہ وہ جوارح سے سرزد تو ہو جائیں اور کسی عمل کا جوارح سے سرزد ہونا اسکے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے قلب میں اس کا منشا موجود ہو اس کیطرف قلب کے رکون و میلان پیدا ہو اور پھر عزم و تہیہ کے ساتھ قلب تعمیل کے لئے تیار ہو جائے۔ یعنی ہر عمل کی تقویم پہلے باطن سے ہوتی ہو اور پھر ظاہر کا آئینہ اسکو چمکا کر سب کے سامنے کر دیتا ہو۔ گویا ہر ایک عملی پیرایہ اپنی حقیقت کا عکس ہوتا اور ہر ایک ظاہر اپنے باطن کا راز فاش کر دیتا ہے۔

پس جس طرح ایک درخت کا تمام ظاہری پھیلاؤ پہلے اپنی چھپی ہوئی جڑ سے ظہور پذیر ہوتا ہی اور پھر جوں جوں اس کی شاخیں ہوا میں پھیلتی جاتی ہیں توں توں جڑ کے ریشے قعر زمین میں پھیلتے اور استحکام حاصل کرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک متشبہ کی ظاہری مشابہتیں سب اپنی باطنی جڑ (میلان و دواعی قلب) سے آشکارا ہوتی ہیں اور پھر جوں جوں تشبہ کے شعبے جوارح پر چھاتے رہتی ہیں توں توں قلب میں دواعی تشبہ کا رسوخ بڑھتا جاتا ہی۔ تاآنکہ ایک دن متشبہ کی تمام تر ترقی اور منتہائے مقاصد یہی تشبہ بنجاتا ہی۔

پس ایک متشبہ تو اسی دھوکہ میں گرفتار ہو کر اس سے اس ظاہری تشبہ بالاغیار کے قبیح آثار ظاہر ہی تک محدود ہیں یا مستقبل میں شاید قلب کو بدلڈالیں گو بالفعل وہ قلب تشبہ سے بری ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کا یہ ظاہری تشبہ بالکفار ابتداء ہی سے اسکے قبح باطن اور قلبی تشبہ کا ایک ظل اور اثر ہی جو قلب کے دواعی تشبہ سے لبریز ہو چکنے کے بعد نمایاں ہوا ہی اور قلبی تشبہ کی دلیل ہی اس ظاہری تشبہ نے قلب میں تشبہ کی تخم ریزی نہیں کی بلکہ قدیم تخم ریزی جو پہلے ہی مناسبات باطن کے سبب قلب میں ہو چکی تھی اس کے ثمرات کو جوارح پر نمایاں کر دیا۔ پس کسی ناسمجھ متشبہ کا ان ظاہری برائیوں کے ہوتے ہوئے باطن کو درست گمان کرنا محض ایک غلط توہم ہی۔ اُسے یقین کر لینا چاہیے کہ سوء ظاہر سوء باطن کی دلیل ہو تہ کہ حسن باطن کی۔ ایسے ناسمجھ انسانوں کو محسوسات

نیز کہ اس محسوس ومشاہد مسئلہ پر بھی ایک نگاہ اعتبار ڈال لینی چاہئیے کہ ایک مریض جس کے چہرہ پر مُردنی چھاگئی ہو آنکھوں میں حلقے پڑگئے ہوں اور جسم زرد پڑچکا ہو تو کیا یہ اسکی مریضانہ صورت اندرونی صحت کی دلیل ہے یا مرض کی؟ ظاہر ہے کہ ایسا نحیف وناتواں پیرایہ تو نقاہت باطن ہی کی دلیل بن سکتا ہے نہ کہ صحت وقوۃ باطن کی۔

ٹھیک اسیطرح جن بدقسمتوں کے اجسام روحانی امراض کی نقاہت کو نمایاں کررہے ہوں جنکے چہرے مہرے ہاتھ پیر جنکے لباس ومطاعم نا مذہبی ودہریت وزندقہ والحاد اور دین فہم کیساتھ شوخی وشوخ چشمی کو عیاں کررہے ہوں کیا یہ اسکی دلیل ہوگی کہ ان کا قلب مذہب ودین اور خشیۃ الٰہی سے لبریز ہے۔ وہ سچے خدا پرست اور ارباب زہد وصلاح میں سے ہیں اور اس تاریکی ظاہر کے ہوتے ہوئے بھی ان کا باطن روحانیت کی صحت سے تازہ اور سرشار ہے؟ کبھی نہیں، کیونکہ روحانی صحت یعنی مذہبی حقیقت اپنی ہی صورت میں کھلتی ہے اور لامذہبی اپنی ہی صورت پر۔ اگر ارباب ورع وتقویٰ ظہور کریں گے تو اپنی ہی متقیانہ شکل پر اور اگر ارباب دجل ودہریت کا خروج ہوگا تو اپنی ہی دہریانہ صورت پر۔

اسی حقیقت کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ

وفی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب

انسان کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہے تو سارا بدن درست ہے اور اگر اس میں فساد آجائے تو سارا بدن فاسد ہوجائے، سنلو وہی لوتھڑا قلب ہے۔ یعنی ظاہر کا صلاح وفساد باطن کے تابع ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اس حقیقت کو اسطرح واضح فرمایا گیا کہ۔

انما الاعمال کالوعاء اذا طاب اسفلہ طاب اعلاہ واذا فسد اسفلہ فسد اعلاہ۔

اعمال مثل برتن کے ہیں جبکہ ان میں کی چیز کا نیچے کا حصہ اچھا ہے تو اوپر کا بھی اچھا ہوگا اور جب تلی کا حصہ خراب خراب ہے تو اوپر کا حصہ بھی خراب ہوگا۔

پس قالب وقالب ایک حقیقت کے دو رُخ اور ایک شئے کو دوسرے ہیں جو ظاہر وباطن یا رُوح وجسد یا

نکتہ چینوں کے اس شبہہ کا تیسرا رکن یہ ہے کہ کسی مامور و منہی کی عام جزئیات قابل التفات نہیں ہوتیں بلکہ مامور و منہی کا فی الجملہ امتثال کافی ہے جو کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینے سے بھی ہو سکتا ہے پس جبکہ ترک تشبہ یا مخالفۂ کفار ایک ایسا ہی منہی عنہ ہے جو بہت سے افراد پر مشتمل ہے تو وہ بھی اپنی کسی ایک آدھ جزئی کے زیر عمل آجانے سے ادا ہو جانا چاہئے یعنی اگر ہم بلا تعیین کسی نہ کسی جزئی میں بھی کفار کی مخالفت کر لیں اور ان سے تشبہ منقطع کر دیں تو ترک تشبہ کا حق ادا ہو جائیگا۔ اور ہم نہی الٰہی کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائیں گے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ترک تشبہ کی ہر ہر جزئی کا خواہ مخواہ امت کو پابند بنایا جاسکے۔

جواب

اول تو ہمارے نزدیک یہ شبہہ کوئی ایسا معتد بہ شبہہ ہی نہیں جس کی بنا کسی صحیح مقدمہ پر ہو یا اسکی کوئی محصل حقیقت قائم ہوتی ہو کہ اس کے جواب کے لئے قلم اٹھایا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مدعی پورے دین کو ضروری اور واجب الاعتبار ماننے کا دعوے رکھتے ہیں اور ضرور رکھتے ہیں جیسا کہ تہذیب الاخلاق میں اسلام اسلام پکارتے اور اپنے کو مسلم ظاہر کرتے ہیں جیسا ہے، تو پھر دین کے کسی جزو کو خواہ وہ کیسا ہی غیر ضروری ٹھیرا دینے کے کیا معنی ہیں؟ اور اگر ان کے نزدیک [illegible] بعض دین کا کوئی ادنیٰ جزئیہ بھی غیر ضروری یا ساقط الاعتبار ہے۔ تو پھر ان کا مجموعہ دین کو ضروری اور واجب الاعتبار کہنا کس حد تک قابل تسلیم ہوگا؟

یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بدفہم انسان پورے انسانی بدن کو تو حکیمانہ صنعت بتلائے لیکن ناخن یا بدن کے رونگیں یا اور کسی عضو کو غیر ضروری اور ناموزوں بھی کہے۔ تو ظاہر ہے کہ اگر وہ ان بعض اعضاء کو غیر حکیمانہ بتلانے میں سچ بول رہا ہے تو یقیناً کل بدن کو حکیمانہ صنعت کہنے میں جھوٹ بول رہا ہے اور اگر کل کے بارے میں سچا ہے تو بلاشبہ اس جزئی دعوی میں جھوٹا ہوا۔

اسیطرح پر فہم و فراست کے دعویدار جبکہ مجموعی اسلام کو تو اپنی زبان سے حکیمانہ امر کہیں لیکن اسلام کے اس اہم جزو ترک تشبہ یا مخالفۃ کفار کے عام شعبوں کا انکار کرنے لگیں تو ضرور ہے کہ وہ بھی اس اقرار و انکار میں سے کسی ایک میں دروغ گو اور کذاب ہوں۔ پس جبکہ ان کے شبہ کے مقدمات ہی باہمی تناقض کیوجہ سے امکان کی سطح پر نہیں آتے تو شبہہ کی حقیقت ہی قائم نہ ہوئی کہ ہم جواب کیطرف التفات کریں۔

لیکن اگر مان لیا جائے کہ یہ شبہہ کوئی اہم اور حل طلب نقطہ ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ یہ مجموعی حیثیت سے مخالفۃ کفار یا ترک تشبہ کے غیر ضروری ہونے کا دعویٰ آیا آپ عملاً کر رہے ہیں یا اعتقاداً اگر آپ محض عملاً ہی اسکو غیر ضروری سمجھتے ہیں کہ کفار سے لباس و معاشرۃ وغیرہ میں کلیۃً مشابہت قطعاً کیجائے کافی ہے کہ کسی ایک آدھ جزو میں کوئی جزوی امتیاز پیدا کر لیا جائے جیسے کوٹ پتلون اور دوسری مخصوص اوضاع نصرانیت اختیار کر کے صرف ٹوپی اسلامی پہن لیجائے۔ تو میں کہتا ہوں کہ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ سارا لباس زنانہ پہنکر اوپر سے ایک مردانہ ٹوپی فی الجملہ امتیاز قائم کرنے کے لئے پہن لیں۔ اور اس حلیہ سے کسی مہذب سوسائٹی میں بے تکلف چلے جائیں۔ نہ آپ کو کسی عار کی پرواہ ہو نہ ملامت کی۔ اگر آپ عرف عام کے خلاف ایسا کر سکتے ہیں تو ممکن ہے کہ عرف شریعت کے خلاف بھی آپ کے اس فی الجملہ امتیاز پر تحمل کیا جا سکے لیکن جبکہ آپکو محض دنیا میں اپنی برابر کی مخلوق سے عار آتا ہے تو کیا غضب ہے کہ یہاں آپ کو خالق سے کوئی عار نہ آئے۔ پھر اگر عورتوں سے تشبہ کرنے والوں اور فی الجملہ امتیاز کو کافی سمجھنے والوں پر آپ ملامت کرنے کو ذرا بھی برا نہیں سمجھتے۔ تو پھر تشبہ بالکفار کرتے وقت جبکہ یہی فی الجملہ امتیاز کا ثبوت بہم پہونچا ہو۔ تو اپنے اوپر ملامت کرنے کو کیوں برا سمجھتے ہو؟

اور اگر آپ کفار کی کلی مخالفت اور تشبہ بالکفار کے کلیۃً ترک کرنے کو عقیدۃً بھی غیر ضروری جانتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آیا آپکے کسی عاقل سے ایسا اعتقاد پیدا کیا جا سکتا ہے کہ جبکہ آپ دین کے کسی شعبہ کو جو بلاشبہ دین سے ہے غیر ضروری اور ساقط الاعتبار کہتے ہیں۔ تو پھر

آپ کو اپنی عاقبت کی فکر کرینی چاہئے کہ یہ تو اللہ اور اس کے رسول پر کھلے بندوں افترا باندھنا اور اس کے دین کے ایک حصہ کی صریح تکذیب کرنا ہی۔

فمن اظلم ممن کذب علی اللہ و کذب بالصدق اذ جاءہ الیس فی جہنم مثوی للکافرین ۔

سو اس شخص سے زیادہ بے انصاف کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور سچی بات کو جبکہ وہ اس کے پاس پہونچے جھٹلا دے کیا جہنم میں ایسے کافروں کا ٹھکانا نہ ہوگا؟۔

اور پھر نہ صرف یہ دین کے کسی ایک حصہ ہی کی تکذیب ہی بلکہ پورے ہی دین کو جھوٹا ٹھیرانا اور سب احتیاطاً بتانا ہی اور بلکہ اپنی رائے سے سارے دین کو منسوخ کر دینا ہے۔

کیونکہ جب آپ کے نزدیک ترک تشبہ کے ذریعہ کفار کی مخالفۃ کلیۃً ضروری نہیں۔ کسی ایک آدھ جزئی میں کافی ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس ایک آدھ جزئی کے علاوہ تمام امور میں کفار کی موافقت جائز ہے۔ اور جبکہ موافقۃ کفار جائز ہے۔ تو بلاشبہ آپ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی مخالفۃ بھی جائز ہی۔ کیونکہ موافقۃ کفار بعینہ مخالفۃ انبیاء ہے۔ ورنہ اگر موافقۃ کفار مخالفۃ انبیاء نہو بلکہ عین موافقۃ انبیاء ہو تو انبیاء علیہم السلام اور کفار کے مقاصد کا واحد ہونا اور اسلام و کفر کا ایک ہوجانا لازم آئیگا۔ اسلئے لامحالہ موافقۃ کفار کو بعینہ مخالفۃ انبیاء ماننا پڑے گا۔

پس آپ سوچ لیجئے کہ اس زعم کے ہوتے ہوئے دین کس طرح باقی رہ سکتا ہے اور رہے تو ضروری کس طرح رہ سکتا ہی۔ کیونکہ دین میں ایک حصہ مامورات کا ہی جسمیں سنن انبیاء کے ساتھ تسنن کرنا سکھلایا گیا ہے۔ جس کو تحلیہ کہنا چاہئے اور ایک حصہ منہیات کا ہے جسمیں سنن کفار سے احتراز کرنا بتلایا گیا ہی جسکو تخلیہ کہنا چاہئے اور جبکہ ان گستاخوں کے نزدیک نہ تشبہ بالانبیاء ضروری نہ ترک تشبہ بالکفار ضروری نہ تحلی بالفضائل ضروری نہ تخلی عن الرذائل ضروری۔ پھر اس میں کیا شبہ ہے کہ ان کے نزدیک مجموعہ دین ہی غیر ضروری ہے۔

اور پھر کوئی ان قومی لیڈر مردوں سے پوچھے کہ معاذ اللہ ایسے غیر ضروری اسلام کو جس کی ضرورۃ عدم ضرورۃ کے مساوی ہو اور جس کے محرمات اس کے جائزات کے ہم رتبہ ہوں۔ گویا

جس میں نہ حلت کا پتہ ہو نہ حرمت کا، نہ اس میں کوئی کبیرہ واجب الترک ہو اور نہ کوئی فریضہ واجب العمل دنیا میں آنے اور تحدی کے ساتھ غیر مذاہب کو مقابلہ میں مبارزت طلبی کی کیا ضرورت تھی؟ کیا غیر ضروری اور مساوی الفعل والترک اُمور پر بھی دنیا میں کبھی تحدی کی گئی اور چیلنج دئے گئے ہیں؟

اور پھر یہ مدعی جواب دیں کہ آخر بسیط ارض پر وہ کونسا اسلام ہے جس کی جامعیت کی دھوم تھی اور جس کے تمام و کمال کا اغیار میں بھی چرچا تھا۔ اگر وہ یہی اسلام ہے جس کی عدم ضرورت کی تصویر تہذیب الاخلاق کے صفحات میں کھینچی گئی ہے تو حیرت ہے کہ خدا کا آخری دین اور اتنا غیر ضروری غیر مکمل اور نا تمام ہو کہ نہ اس میں کوئی چیز صبر کرنے کی ہو نہ چھوڑنے کی۔ اور اگر وہ نہیں اور وہ کوئی جو تہذیب الاخلاق کے مؤلف کو بھی تاب دستیاب نہیں ہو سکا تھا تو بجائے اس کے کہ خواہ مخواہ اس بلا دلیل اعتقاد کے ادعا سے مسلمانوں کو دھوکہ میں ڈالتے مناسب تھا کہ اس صحیح اسلام کی تلاش میں لگتے۔

کیا ان مدعیان شعور کو دین میں اتنا بھی شعور نصیب نہ ہو سکا کہ تمام جزئیات دین کو اس طرح ناقابل التفات ٹھیرا دینے اور عمل کے ہر ممنوع و محرم حصہ کے متعلق لا بأس ولا حرج کہہ دینے میں اس کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اُمت ارتکاب کبائر اور ترک فرائض پر جری ہو کر ایک ایک کرکے اس سے اسلامی شعبے رخصت ہو جائیں۔ اسلامی خصوصیات مٹ جائیں اور غیر اسلامی شعائر بادلوں کی طرح اُمت پر چھا جائیں جیسا کہ یونہی واقعہ وقوع پذیر ہو بھی رہا ہے۔

پھر کوئی ان مدعیان دانش و بینش سے پوچھے کہ کیا انہوں نے قوم کیلئے یہ کوئی اچھی اور مفید تجویز کی یا سد ذریعہ کا رد کرتے ہوئے اُمت کو ایک ایسے ضلالت انگیز اور خباثت آمیز راستہ پر ڈالدیا کہ ان کے قلوب پر اتباع ہدیٰ اور خیر کے دروازے تو بند ہو جائیں اور اتباع ہویٰ اور شر کی راہیں کھل جائیں۔ ہر شخص اپنے قول و عمل میں بے قید و مطلق العنان ہو، ہر معصیت پر لا بأس کا حرج ہو اور اس طرح دنیا معاصی کا ایک جہنم بنجائے۔

کسقدر عبرت کی جگہ ہے کہ اُمت کے اسلاف اور فقہاء نے تو حرمات حدود اور تحفظ اُصول کی خاطر

مشتبہات بلکہ کتنے ہی مباحات سے بھی امت کو بطور سد ذرائع باز رکھنے کی سعی کی۔ تاآنکہ آج دین اپنی اصلی صورت میں اخلاف تک پہنچ گیا۔ لیکن ان مدعیان تفقہ نے اپنی اہواء کی خاطر پہلے اس کے اصول وحدود مقاصد ہی پر ہاتھ صاف کیا۔ تاآنکہ اپنے اور کتنوں ہی کے قلوب سے وہ اسلاف کی جمع کردہ پونجی نہایت سہولت سے کھو بیٹھے اور راہ استقامت سے ہٹ گئے۔ فَضَلُّوا وَاَضَلُّوا۔

بہر حال اگر ان نکتہ چینیوں نے مخالفۃ کفار کے کلیۃً غیر ضروری ہونے کا اعتقاد بلا تاویل ہی دل میں جما لیا تو انہوں نے نہ صرف مخالفۃ کفار ہی کو غیر ضروری کہا بلکہ موافقۃ انبیا کو بھی غیر ضروری کہنے کے مجرم بنینگے اور اس ناقابل تلافی جرم کی عاقبت وعقوبت وہ خود سوچ لیں۔

ہاں اگر انہوں نے مخالفۃ کفار اور موافقۃ انبیاء کے کلیۃً غیر ضروری ہونے کا اعتقاد کسی تاویل سے کیا جس کی تقریر شاید یوں کیجائے کہ یہ مخالفۃ و موافقۃ جبکہ امر و نہی کے ذریعہ طلب کیگئی تو موافقۃ انبیا کا امر اَطِیعُوا الرَّسُوْل (رسول کی اطاعت کرو) اور یہ مخالفۃ کفار کی نہی لَا تَتَّبِعُوْا یا لَا تَشَبَّهُوْا بِالْکُفَّار (کفار سے مشابہت مت کرو یا ان کا اتباع مت کرو) فعل ہونے کی حیثیت سے ایک مطلق ہے جس کے ذریعہ علی الاطلاق کا حکم یہ موافقۃ انبیاء اور مخالفۃ کفار طلب کیگئی ہے۔ اور مطلق کے متعلق اصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ وہ اپنی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزئی پر بھی عمل ہو جانے سے ادا ہو جاتا ہے تو تو ہم اگر کسی ایک آدھ جزئی میں بھی انبیاء علیہم السلام کی موافقت کرلیں اور باقی امور میں خلاف رہیں یا مطلق کسی ایک آدھ جزئی میں کفار کا خلاف کرلیں اور باقی تمام امور میں انکے موافق رہیں تو ہم دونوں امر اتبعوا اور نہی لا تشبہوا کا حق ادا کر دینگے۔ کیا ضرورت ہے کہ ایک ایک جزئی میں انبیاء علیہم السلام کی کلی موافقت اور کفار کی کلی مخالفۃ ضروری ٹھیرا دیجائے۔

تو ہم اس عجیب وغریب تاویل کو سامنے رکھکر جس سے سوال کی زیغ قلب اتباع متشابہ اور ابتغاء فتنہ کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے کہتے ہیں کہ نہ ان سولوں نے حقیقۃ مطلقہ کی حقیقت کو سمجھا اور نہ اسکے محاورات اسالیب استعمال ہی پر مطلع ہو سکے۔ انہوں نے ناسمجھی سے یہ تو دعویٰ کردیا کہ اتباع انبیاء جو امر ہے اور اتباع کفار جو نہی عنہ ہے فعل ہونے کی حیثیت سے ایک حقیقۃ مطلقہ

ہے جس میں عموم کا دخل نہیں۔ اور اس اصول پر اگر اس اتباع انبیاء اور ترک اتباع کفار کا کوئی ادنیٰ سا جزو بھی ادا کر دیا جائے۔ تو یہ حقیقت مطلقہ ادا ہو جانی چاہیئے اور مخاطبوں کو امر و نہی کی ذمہ داریوں سے ہلکا بھی ہو جانا چاہیئے۔

لیکن ان لاعلم نکتہ چینوں کو اسکی کیا خبر ہے کہ کبھی کبھی مطلق کی حقیقت پر دوسرے قواعد نحویہ غالب آکر اُسے اپنی ماہیت سے نکال دیتے ہیں۔ وہ مطلق ہونے کے بجائے عام بن جاتا اور اسکی حقیقت مطلقہ حقیقت عامہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی مطلق یا نکرہ نفی کے تحت میں آجائے تو پھر اس کا اطلاق فنا ہو کر عموم کیلئے جگہ خالی کر دیتا ہے اور اسکے افراد کو اطلاق کے بجائے استغراق گھیر لیتا ہے۔

پس سابق اطلاق میں اگر کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینا کفایت کرتا تھا اور مطلق کی حقیقت ادا ہو جاتی تھی تو عموم و استغراق میں اس کا ہر ہر فرد ضروری العمل ہو جاتا اور کسی ایک آدھ فرد پر عمل کر لینا عموم کی ادا حقیقت کے لئے ناکافی ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو امر کیا جائے کہ۔

وافق احدًا من المسلمین ۔	تم مسلمانوں میں سے کسی کے ساتھ موافقت کرو۔

تو یہ نکرہ (احدًا) ابھی تک اپنے اطلاق پر ہے۔ اگر مامور نے مسلمانوں کے کسی ایک فرد واحد کیساتھ بھی موافقت کرلی۔ تو بلاشبہ اس نے امر کا حق ادا کر دیا۔ ضروری نہیں ہے کہ اس حقیقت مطلقہ کی ادائیگی کے لئے ساری ہی افراد مسلمین کیساتھ موافقت ضروری سمجھی جائے۔ لیکن اگر کسی موافقت کی نفی کی جائے اور اسکو نہی بنا کر اسطرح ادا کیا جائے کہ۔

لا توافق احدًا من الکفار ۔	کفار میں سے کسی سے موافقت کرو۔

تو اب یہ نکرہ منفیہ بجائے مطلق ہونے کے عام بن گیا جس کے ہر ہر فرد کو زیر نفی لانا ضروری ہو گیا پس اگر مامور نے ہر ہر فرد سے اپنی موافقت قطع کرلی۔ تب تو اس نے نہی کا حق ادا کیا اور اگر کفار کے کسی ایک فرد سے بھی موافقت باقی رہ گئی تو نہی کی تعمیل سے ضرور قاصر سمجھا جائیگا۔

ٹھیک اسیطرح جبکہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تشبہ بالکفار یا انکی موافقت کفار سے نہی کی

اور فرمایا کہ۔

لا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا۔	گمراہوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو۔
لا تتبعوا السبل۔	کج راستوں پر مت چلو۔
لا تتبع سبیل المفسدین۔	مفسدوں کی راہ مت اختیار کرو۔
لا تکونوا کالذین اذوا موسیٰ۔	موسیٰ علیہ السلام کے ایذا دہندوں کی مانند مت بنو۔
لا تکونوا کالذین کفروا۔	کافروں کی مانند مت ہو۔

یا حدیث نے نہی کی کہ۔

لا تشبھوا بالاعاجم لیس منا من تشبہ بقوم غیرنا۔	عجمیوں کی ساتھ تشبہ مت کرو۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے اغیار سے تشبہ کرے۔

یا کہیں اسی منفی حقیقۃ کو بصورت اثبات ادا فرمایا کہ۔

خالفوا اھل البوادی۔	خلاف کرو جنگلیوں کا۔
خالفوا الاعراب۔	خلاف کرو گنواروں کا۔
خالفوا الاعاجم۔	خلاف کرو عجمیوں کا۔
خالفوا المشرکین۔	خلاف کرو مشرکوں کا۔

تو اسی مذکورہ اصول کے موافق جبکہ خلاف کفار اور مخالفۃ مشرکین یا تجلیۃ اہل ہوئی کی حقیقت مطلقہ زیر نہی آئی تو عام بن گئی اور اسوقت تک ادا شدہ نہ سمجھی جاویگی۔ جب تک کہ اس اتباع کفار یا تشبہ بالاقوام کے ایک ایک جزئی سے احتراز ضروری نہ سمجھا جاوے۔
پس اب بھی مخالفۃ کفار کو حقیقۃ مطلقہ کہکر کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینے سے اُسے اداشدہ ماننا نہایت ہی بے خبری اور غفلت پر مبنی ہوگا۔
ہاں سوال یہ باقی رہا کہ اس منہی عنہ موافقۃ کفار کو تو نفی نے عام بنا دیا اس لئے اس کا ہر ہر فرد ضروری العمل بنگیا۔ لیکن موافقۃ انبیاء تو مامور بہ اور مثبت ہونے کی وجہ سے اپنے اطلاق

اُس کے تمام اجزا کا اتباع بھی مطلوب ہی۔ ورنہ کل کے مطلوب ہونے اور اسکے کل اجزا کے مطلوب
نہونے کے کوئی معنی نہیں۔ پس اس اسلوب پر اتباع انبیا کا عموم وشمول اور استغراق اور بھی زیادہ
نمایاں ہوجاتا اور اطلاق محض باطل ٹھہر جاتا ہی۔

بہرحال جبکہ موافقت انبیا اور مخالفت کفار کی حقیقتیں اپنے اندر کوئی ایسا اطلاق نہیں رکھتیں جو
نکتہ چینیوں کی تغلیط مبالات اور عملی توانی میں مدد دیسکے۔ بلکہ ایسا عموم رکھتی ہیں جو اپنے سارے ہی
افراد پر حاوی وشامل ہی۔ تو اب یہ مخالفت وموافقت اپنے اجزا یا افراد کے لحاظ سے ایک کل اور
مجموعہ کی حیثیت میں آگئیں۔ اور ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی حسی ومعنوی مجموعہ بغیر اپنے سارے اجزا
کی فراہمی کے قائم نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک ایک کرکے اسکے اجزا ختم کردئے جائیں۔ اور باقیماندہ
اجزا پر قناعت کرلیجاسکے تو یہی (باعتبار) اس مجموعہ کا نقصان اور آخر کار اس کا مٹ جانا تصور
کیا جائیگا۔ پس ہر ایک مجموعہ کی بقا صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ اسکے چھوٹے سے چھوٹے
جزو کا وہی تحفظ کیا جائے جو اسکے بڑے سے بڑے جزو کا کیا جاسکتا ہی۔

دیکھو ایک حسین کے حسن کے لئے تمام اعضا بدن کا موزوں ہونا شرط ہی۔ بیاض بشرہ
اور سواد مو۔ آنکھ کی بڑائی اور ہاتھ پیر کی موزوں چھوٹائی۔ قدوقامت کی خوبی اور چال ڈھال
کی پسندیدگی حتی کہ صوت وکلام کی دلکشی اور دوسری بہت سی شرائط حسن کا پایا جانا ضروری
ہے۔ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ اگر آنکھ چھوٹی ہے تو ہو کہ رنگ تو سفید ہے۔ اگر آواز بھدی ہے تو ہو
دہن تو غنچہ مثال ہی۔ اور اگر بعض اعضا میں موزونیت نہیں تو نہو کہ اور دوسرے بعض میں تو ہی
حسن معنوی میں لو تو مثلاً ایک جامع عالم ہیوقت اس اعلیٰ خطاب کا اہل تصور کیا جاسکتا
ہے جبکہ علوم عالیہ کے درجہ میں قرآن وسنت اور اصول وفروع فقہ وغیرہ سے واقف ہو اور علوم آلیہ
کے درجہ میں ادبی فنون پھر معقولات کی اصطلاحات سے بے خبر نہو۔ نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ فقہ کی
جزئیات سے واقف نہیں تو حدیث سے تو ہی اور اگر قرآن نہیں جانتا تو اصول تو جانتا ہے
پھر کیا بوالعجبی ہے کہ ایک حسین کا مجموعی حسن تو چند جزوی نقصانات سے ہرنا ٹھہر جائے

اور ایک عالم کی جامعیت پر چند فنون کی لاعلمیوں سے حرف آجائے لیکن خدا کے دین کی حسین ہیئت و شکل اور جامع حقیقت میں جبکہ وہ غربت زدہ ہو کر ان معطلع رفتار مردوں کے ہاتھوں پڑے نہ صرف جزوی بلکہ اصولی قطع و برید سے بھی کوئی بدنمائی رُونما ہو۔

یہ بنے ہوئے روشن خیال اطلاق کی اڑ لیکر اسکو صورتاً اور سیرۃً بدل دیں۔ التباس تشبہ بالکفار سے اس کا نقشہ پلٹ دیں۔ اور سینکڑوں جدید سانچوں میں ڈھالکر اسکو دنیا کے سامنے لائیں لیکن پھر بھی وہ اسی صدر اول کا تام و کامل اور حسین و جمیل اسلام رہے۔ اور یہ برعکس نام نہند روشن خیال نہایت ہی مستند اور قدیم روایات کے حامل مسلمان پکارے جانے کے مستحق رہیں؟ کلا۔ بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔

پس اگر اس قسم کے مجموعوں کو جو اپنے بہت سارے اجزا پر محیط ہیں طلب کیا جائے تو ضرور ہے کہ مع تمام اجزا ہی کے طلب کیا جا سکتا ہے ورنہ اگر مجموعہ کی طلب کے وقت اسکے اجزاء مطلوب نہوں یا کچھ ہوں اور کچھ نہوں تو یہ طلب ہی محض لغو اور عبث ہوگی۔

پس نہ تو ایک طالب مجموعہ کی غرض مجموعہ کے تمام اجزاء جمع کئے بغیر پوری ہو سکتی ہے اور نہ اس مامور ہی کو مجموعہ کا امتثال کنندہ کہا جا سکتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ہم نے کسی معمار کو ایک مکان بنانے کا امر کیا اور اس نے ایک دیوار یا صرف محراب بناکر سمجھ لیا کہ اس نے ہمارے امر کی تعمیل کر دی کیا وہ صحیح سمجھا؟ ہرگز نہیں کیونکہ مکان ایک کل اور مجموعہ ہے جو عرفاً دیواروں ستونوں۔ چھتوں در و دریچہ وغیرہ اجزا پر مشتمل ہے۔ فقط دیوار یا فقط محراب کو مکان نہیں کہتے۔ پس یہ مجموعہ اپنے سارے ہی اجزا سے ظہور پذیر بھی ہو سکتا ہے اور پورے ہی اجزا کو تعمیر کر کے ایک معمار ہمارے امر کا حق ادا کرنے والا بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی فطری اصول پر سمجھ لو کہ اگر بارگاہ حق سے کسی مجموعہ کی مانگ ہو خواہ وہ مجموعہ عبادات میں سے ہو یا افعال جن سے پھر اخلاق میں سے ہو یا اوصاف میں سے۔ اور بندے اس مجموعہ کے کسی ایک آدھ جزو کو تو حاضر کر دیں اور بقیہ اجزاء کو پاس بہ کر چھوڑ دیں تو کیا ان کو اس فرمان کا معمار

کبھی طرح نہیں کہا جائیگا کہ انہوں نے بھی امرِ الٰہی کا کوئی حق ادا نہیں کیا اور ہرگز وہ امر کی سُونتہ سی سے نکلے نہیں ہوئے؟ ضرور کہا جائیگا۔

اعیان مثلاً اعیان میں لو تو قرآن کریم نے۔

فاغسلوا وجوھکم (وضو کرتے ہوئے) اپنے چہروں کو دھوؤ

میں امر کے ذریعہ ہم سے چہرہ دھونے کی طلب کی۔

اور وجہ یا چہرہ ایک عین ہے جو چند اجزاء پیشانی، آنکھ، ناک، رخسارہ، اور ذقن وغیرہ پر حاوی ہونے کے سبب ایک مجموعہ اور کل ہے۔ اسلئے تنہا پیشانی یا رخسارہ کو چہرہ نہیں کہہ سکتے پس اگر ہم نے فقط رخسارہ یا پیشانی دھوڈالی یا تنہا ناک پر پانی کے چند قطرے ٹپکا دیئے تو نہ کہا جائیگا کہ ہم نے چہرہ دھولیا۔ کیونکہ چہرہ ان انفرادی اجزاء کا نام نہ تھا بلکہ بحیثیت مجموعی کل اجزاء کا اسلئے یقیناً ہم اس امر کی تعمیل سے قاصر رہے۔ کسی طرح یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ چہرہ کا دھونا ایک حقیقت مطلقہ تھا اگر ہم اسکے کسی فرد یا جزو پر عامل ہوگئے تو ہم تعمیل امر سے عہدہ برآ بھی ہوگئے۔

افعال اسی طرح افعالِ مشرعیہ کے سلسلہ میں دیکھو تو صلوٰۃ ایک شرعی فعل ہے جس کے اقامتہ کا قرآن کریم نے ہمیں حکم فرمایا کہ۔

اقیموا الصّلوٰۃ - نماز درست کرکے پڑھو۔

یہ فعل صلوٰۃ ایک کل اور ایک مجموعہ ہے جسکے اجزاء مثلاً رکوع و سجود قیام و قعود اور قومہ جلسہ وغیرہ ہیں۔ تنہا رکوع یا سجود یا قیام کو نماز نہیں کہتے۔ پس اگر ہم نے صرف رکوع کرلیا یا صرف قیام کرکے سلام پھیر دیا۔ یا دو رکعت کی نماز کو ایک رکعت پر ختم کر دیا تو بلاشبہ ہم نے نماز نہ پڑھی کیونکہ نماز ان انفرادی اجزاء کا نام نہ تھا بلکہ مجموعہ کا اور جب مجموعہ ادا نہ کیا گیا تو ہم امر صلوٰۃ کے امتثال سے بالکلیہ قاصر رہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض اجزاء ادا کر دینے سے صلوٰۃ ادا ہوگئی کہ وہ امر کے ذریعہ طلب کئے جانے کے سبب ایک حقیقۃ مطلقہ تھی۔

اخلاق اخلاق حسنہ کے سلسلہ میں اگر ہم کسی کو امر کریں کہ۔

میں قرآن سے مخالفت کی۔ اور باقی شعبوں میں اپنے لباس کی مطلق احتیاط اور لاابالی پن سے اُن کے مشابہ اور موافق بن گئے۔ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے اس مطلوب مخالفت کو ادا کر دیا اور امر و نہی کی توجیہ سے ہلکے ہو گئے۔ کیونکہ مطلوبہ مخالفت جبکہ ایک مجموعہ تھا تو وہ مجموعہ اپنے تمام اجزاء ہی سے قائم ہو سکتا تھا نہ کہ ایک آدھ جزو سے۔

پس اسی طرح از روئے مذکورہ نظائر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اوامر کے ذریعہ ان ایمان و افعال اور اخلاق و اوصاف کی حقائق مطلقہ طلب کی گئی ہیں، جو چہرہ میں فقط ناک دھو لینے اور نماز میں صرف سجدہ کر لینے اور اکرام پیر و ولد کو سب کچھ سمجھ لینے اور ضیافت میں مہمان کو ایک آدھ لقمہ کھلا دینے سے پوری ہو سکتی ہیں۔ ضروری ہے کہ سارے ہی اجزاء کو عمل میں جمع کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ موافقت انبیاء اور مخالفت کفار یا ترک تشبہ (جبکہ اس کا عام اور حقیقی مستغرق ہونا ثابت کیا جا چکا) ایک حقیقت مطلقہ ہے جو صرف کسی ایک آدھ جزئی میں مخالفت کر لینے سے ادا ہو سکتی ہے۔ ضرورت نہیں ہے کہ خلاف کے سارے ہی اجزاء زیر عمل آئیں کیونکہ ہر ایک عام یا مجموعہ جیسا کہ شریعت ہی اُسے مخصوص یا بعض نہ بنا دے اپنے سارے ہی اجزاء سے قائم ہو سکتا ہے نہ کہ ایک آدھ جزو سے۔ اور ہر ایک مجموعہ جب طلب کیا جائیگا تو وہ سارے ہی اجزاء کے پیش کر دینے سے ادا بھی ہو سکیگا نہ کہ ایک آدھ جزو سے۔

پس نکتہ چینوں کو موافقت انبیاء اور مخالفت کفار کو حقیقت مطلقہ گمان کر کے اس دھوکہ میں نہ آنا چاہئے کہ اگر اس کا اکثر حصہ چھوڑ دیں اور ایک آدھ جزئی بھی زیر عمل آجائے تو کافی ہے۔ اور ہمیں اسے حقیقت عامہ یقین کر کے اس تعلیم پر عمل کرنا کہ اگر اکثر حصہ زیر عمل آکر ایک آدھ جزو بھی چھوٹ جائے تو وہ بھی ناکافی اور ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ فشتان ما بین مشرق و مغرب۔

یہ گفتگو اس تقدیر پر تھی کہ موافقت و مخالفت کو ہم نے حقیقت مطلقہ تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ بلکہ حقیقت عامہ مانا تھا۔ لیکن اگر ہم بھی نکتہ چینوں کی طرح تھوڑی دیر کے لئے ان حقائق کو مطلق ہی تسلیم کر لیں تب بھی ان کا یہ شبہ کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ وہ ان حقائق کی کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کے

امر و نہی کے بوجھ سے بری الذمہ ہو جائیں اور اداءِ حقیقت کے لئے صرف اتنا ہی جزوی عمل کافی
خیال کرنے لگیں۔ کیونکہ ہم موافقۃِ انبیاء اور مخالفۃِ کفار کو ایسا مطلق نہیں تسلیم کرتے جس کے کسی ایک
آدھ ہی جزو کو شریعت کافی سمجھتی ہو۔ بلکہ ایک ایسا مطلق مانتے ہیں جس کا فردِ کامل شریعت کو
مطلوب ہے اور ظاہر ہے کہ فردِ کامل وہی ہو سکتا ہے جس میں کماً و کیفاً حقیقت کا غالب اور معظم حصہ
آجائے۔

ورنہ اگر اتبعوا سے کوئی سا جزوی اتباع اور خالفوا سے کوئی سا جزوی خلاف مطلوب ہی
تو یہ طلب ہی عبث اور لاطائل ہو جاتی ہے کیونکہ ان دونوں صیغوں سے خطاب مسلم کو ہے اور مسلم
جب تک کہ وہ مسلم ہے طبعی اور فطری طور پر ضرور ہے کہ ادھر تو اتباعِ انبیاء کے کسی نہ کسی جزو پر
اعتقاداً یا عملاً قائم ہو اور ادھر خلافِ کفار کے کسی نہ کسی جزو پر ضرور جما ہوا ہو۔ ورنہ اگر ایک مسلم
اتباعِ انبیاء کے کسی ایک جزو کو بھی اعتقاداً یا عملاً لئے ہوئے نہ ہو۔ اور ایسے ہی خلافِ کفار کے کسی شعبہ
پر بھی قائم نہ ہو گویا بالفاظِ دیگر عدوِ انبیاء ہو اور حبیبِ کفار ہو۔ تو وہ مسلم ہی کب ہے کہ ان اوامر کا اسے
مخاطب سمجھا جائے۔

اور پھر یہ جزوی موافقۃ اور مخالفۃ طبعی طور پر نہ صرف مسلم ہی میں پائی جانی ضروری ہو بلکہ
میرے خیال میں تو کوئی کافر بھی ایسا نہیں نکل سکتا جو اسوۂ انبیاء کے کسی نہ کسی جزو کا متبع اور
اسوۂ دجل و شیطنت کے کسی نہ کسی جزو سے متنفر نہ ہو۔ پس جبکہ اس اتباع و خلاف کے کسی نہ کسی
جزو کا پابند ہونا ایسا طبعی اور غیر اختیاری امر ہے کہ مسلم ہی نہیں کافر تک اس کا پابند ہے اور وہ پابندی
بلا کسی اہتمام کے ہے تو پھر اتبعوا اور خالفوا کے اطلاق سے بھی یہی جزوی حصہ طلب کیا جانا
محض بے سود اور تحصیلِ حاصل ہے اور گویا ایک مسلم کو کافر کی برابر رکھنے پر راضی ہو جانا ہے۔ اس لئے
ضرور ہے کہ امر و نہی سے اس اتباع و خلاف کا وہ حصہ مطلوب ہو جو اس طبعی اور غیر اختیاری حد سے
کچھ آگے ہو۔ بس اسی غالب حصہ کو ہم ان حقائقِ مطلقہ کا فردِ کامل کہیں گے۔

پس اتباعِ انبیاء کا فردِ کامل تو یہ ہے کہ وہ ایک آدھ جزو سے گذر کر اس حد تک پہنچ جائے

گویہ مسلم اپنے اکثری حالات کے اعتبار سے عرفِ عام میں کسی نبی کے مسلک کا پیرو اور انکے مخالف
مسلک سے متنفر پکارا جانے لگے۔ اور خلافِ کفار یا ترکِ تشبہ کا فردِ کامل یہ ہے کہ وہ ایک آدھ
جزئی سے گذر کر اس حد پر آجائے کہ ایک مسلم کفار سے صورتاً و سیرتاً تدیناً و تمدناً الگ ہونے کے سبب
عرفِ عام میں مخالفِ کفار کہا جانے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ممیز درجہ (جسکو ہم مطلق کا فردِ کامل کہہ رہے
ہیں) اس مطلق کی کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کرنے اور بقیہ جزئیات کو لاابالی پن سے چھوڑ دینے
سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ظاہر و باطن کے اکثر اور غالب شعبوں پر عملدرآمد کرنے سے ظہور پذیر ہو سکتا
ہے۔ اسلئے جب شریعت ان مطلق حقائق کو طلب کریگی تو یقیناً ان کے اس ممیز درجہ ہی کو طلب کریگی
اور اسلئے اس ممیز درجہ کو ادا کئے بغیر کسی طرح اس مطلق کی ادائگی متصور نہیں ہو سکتی۔

پس نکتہ چین مطلق کی آڑ لیکر جس آزادی مطلق العنانی اور بے دینی کی شرعی رنگ میں بنیاد
رکھنا چاہتے تھے۔ وہ قائم نہو سکی اور جسقدر قائم ہوئی تھی وہ الحمدللہ منہدم ہوگئی۔ اور ثابت ہوگیا
کہ جبتک ترکِ تشبہ کا کل یا غالب حصہ زیرِ عمل نہ آجائے۔ اسوقت تک کوئی مسلم تارکِ تشبہ نہیں
کہلایا جا سکتا۔

آخر میں ہم ایک عجیب و غریب نتیجہ لکھکر حدیث مَن تَشَبَّہَ کی اس مناظرانہ بحث کو ختم
کر دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ سید صاحب نے باوجودیکہ حدیث مَن تَشَبَّہَ کی تردید و تکذیب
میں کوئی انتہائی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ "جادو وہی ہے جو سر پر چڑھکر
بولے" وہ صدا انکار کے باوجود بھی مسئلہ تشبہ کو ماننے پر بمجبور ہو گئے۔ انہوں نے حدیث مَن تَشَبَّہَ
کی فطری حقیقت سے بھاگنے کی کتنی ہی سعی کی۔ مگر فطرت نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور آخرکار انہی کے
منکرانہ کلام سے مقرانہ اعتراف کرالیا گو یہ اعتراف ان کے خلافِ مرضی ہو۔ وہ حدیث مَن تَشَبَّہَ
کو بزعم خود پوری طرح رد کر دینے اور غیر معقول ٹھیرا دینے کے بعد بر سبیل تنزل اس حدیث کا ایک
محمل تجویز فرماتے ہیں کہ۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا جس کو میں آئندہ سے قول کہونگا کیونکہ میرے

و لحد کی رعایتیں وغیرہ سب ہی امور گویا آپ کے نزدیک معاذ اللہ لغو اور عبث ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ حکمیات شریعت کا ایسا پر لا انجود و انکار کہ جسمیں کلام رسول بھی رد ہو جائے اور اجماع امت بھی اسلام و ایمان کی ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور اسلئے ان فرومات شرعیہ میں آپ ہمارے مخاطب بھی نہیں رہتے بلکہ کلام کا سلسلہ آگے بڑھتے۔

ہاں اگر آپ کے نزدیک واجب ہے کہ مسلمان میت کی تجہیز و تکفین اسلامی ہی طریق پر ہونی چاہیئے اور ہرگز جائز نہیں کہ مسلمان کا مردہ ہندو کیطرح جلا دیا جائے۔ یا پارسیوں کیطرح چیل اور کوؤں کی نذر کر دیا جائے یا عیسائیوں کیطرح کسی ستون میں کھڑا چن دیا جائے تو پھر آپ کے اقرار سے صاف طور پر یہ اقرار بھی نکل آتا کہ مسلمان کیلئے یہ قومی امتیاز اور ترک تشبہ بھی واجب ہے۔

کیونکہ آپ کے نزدیک جب موت زحام میں اسلامی تجہیز و تکفین کا واجب بغیر ظاہری امتیاز کے ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ آپ کے نزدیک واجب ہے تو کوئی وجہ نہیں جاتا ہے کہ جس پر واجب کی ادائگی موقوف ہو وہ خود بھی واجب ہوتا ہی کہ مقدمۃ الواجب واجب اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ امتیاز اور ترک تشبہ بھی اپنے اوقات اژدحام میں واجب ہے۔

اور الحمد للہ کہ آپ ہی کے منکر قلم سے کم از کم موت زحام کے وقت امتیاز اور ترک تشبہ کا وجود بھی ثابت ہو گیا اور وجوب بھی۔ اور پھر جبکہ موت اژدحام کے وقت آپ کو امتیاز اور ترک تشبہ کے وجود و وجوب ماننے سے چارہ نہ رہا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کو موت زحام سے پہلے زندگی کی ہر ہر ساعت میں بھی اس ترک تشبہ کے وجود و وجوب ماننے سے کوئی مفر نہیں رہا۔

کیونکہ سوال یہ ہے کہ یہ قومی امتیازات (جن سے ایک مردہ بعد الموت پہچانا جا سکتا) آیا اس موت زحام ہی کے لئے اختیار کئے گئے تھے یا موت سے پہلے کی عام زندگی کے لئے اگر کہا جائے کہ یہ مخصوص لباس وغیرہ محض موت ہی کے استقبال کے لئے مہیا کئے گئے تھے۔ اور ان کی غرض صرف یہی تھی کہ ان میں موت آجائے تو یہ اسوجہ سے غلط ہی کہ نہ تو آجتک دنیا کی کسی قوم نے محض موت کیلئے کوئی وردی تجویز کی (کہ ایسا کرنا کوئی معتد بہ غرض ہی نہیں تھی) اور نہ کسی کے علم میں موت کا

کوئی وقت ہی متعین ہوا کہ اس کیلئے ایسی تیاری کرلی جائے۔

پس دوسری صورت خودبخود متعین ہوگئی کہ یہ امتیازی نشانات ان مرنے والوں کی زندگی کے نشانات تھے نہ کہ موت کے۔ وہ ان مرنے والوں نے جو کسی اسلامی امتیاز کے سبب اسلامی تجہیز وتکفین سے مشرف ہوئے، اپنی پوری ہی زندگی میں یہ چاہا کہ وہ اپنے کو غیر مسلم اقوام سے صورتاً وسیرتاً ممتاز رکھیں اور ترک تشبہ پر جمع رہیں تاکہ بعد الموت بھی جبکہ وہ غیر مسلم اقوام کے مُردوں میں گڈمڈ ہوں انہیں مسلم ہی پکارا جائے اور مسلموں ہی کے احکام واعمال اُن پر جاری کئے جائیں۔

پس سید صاحب کے کلام سے ترک تشبہ کا وجود و وجوب نہ صرف موت ہی کے وقت کیلئے نکلا بلکہ زندگی کی ہر ہر ساعت کیلئے بھی نکل آیا۔ اور یہی وہ مدعیٰ تھا کہ جس کی تائید کیلئے تو ہم قلم اٹھاتے تھے اور تردید کیلئے سید صاحب نے قلم اٹھایا تھا گویا ان کے منافی قلم نے انجام پر پہنچ کر انھیں ہی رد کردیا اور ان کے ساتھ نفاق برتا بلکہ اگر ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ ان جنازہ مُردوں کو فوری موت اژدحام کا علم ہو جائے جیسا کہ کسی وبا کے ہیجان کے وقت عموماً وحشت زدہ تیماردار مُردوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور اس کس مپرسی کی حالت میں مسلم وغیر مسلم مُردوں کے مخلوط وگڈمڈ ہو جانے کا ظن غالب ہو یا کوئی جنگ عظیم برپا ہو اور مسلم وغیر مسلم مُردوں میدان مصاف کے پُر ہو جانے کا خطرہ آنکھوں کے سامنے منظر آ رہا ہو اور اس وقت یہ مرنے والے اسی نیت سے اسلامی لباس و وضع اختیار کریں کہ ان کی موت اسی ہیئت میں آجائے تب بھی ہمارا ہی مقصد روشنی میں آتا اور ترک تشبہ کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ سوال یہ ہے کہ جب وہ بعد الموت اس لباس و وضع سے از خود کوئی بھی حظ حاصل نہیں کر سکتے تو پھر انہوں نے عین مرنے کے وقت اس ترک تشبہ کو کیوں اختیار کیا؟ اگر اسلئے کیا اور ظاہر ہے کہ محض اسی لئے کہ وہ بعد الموت مسلمان سمجھے جائیں اور ایسا نہ ہو کہ غیر اقوام کے مُردوں میں شامل کر کے انہیں اسلامی احکام کے اجراء سے محروم کردیا جائے۔ تو پھر میں کہتا ہوں کہ جس نوع اسلامی اجراء احکام کی علت نے انھیں بعد الموت ترک تشبہ پر مجبور کردیا وہی علت کیا حالت حیات میں موجود ہے جو زندگی میں انھیں اسلامی شعائر اور ترک تشبہ پر مجبور کر سکتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنی زندگی

میں غیر اقوام سے تشبہ ترک نہ کرے بلکہ نصرانی صورت اور یہودی ہیئۃ بنجائے تو کتنے ہی اسلامی احکام اور دینی ارضاع کی برکات سے قبل الموت بھی محروم ہوجائے۔ پس اگر یہ محرومی بعد الموت خطرناک ہے تو قبل الموت اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ ہی حیات قبل الموت حیات بعد الموت کا خاکہ اور نقشہ ہے جس پر آخرۃ کی تعمیر کھڑی کردی جائیگی۔ پس اگر یہ زندگی اسلامی ہے تو موت کے بعد کی زندگی بھی اسلامی ہو سکتی ہے یعنی اگر دنیا کی زندگی میں ایک مسلم تمام اقوام کفر سے ممتاز اور الگ ہے تو آخرۃ کی زندگی میں بھی اپنے حشر و نشر اور دائمی ٹھکانوں کے لحاظ سے ممتاز اور الگ ہی رہیگا۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ۔

تحشرون كما تموتون وتموتون كما تحيون۔	تمہارا حشر ویسا ہوگا جیسے مرے تھے اور مرو گے اسی حال میں جیسی زندگی گذاری تھی۔

نیز جسکو غیر اقوام کے تشابہ و التباس سے یہ نفرت ہو کہ وہ موت کے بعد تک کے لئے ترک تشبہ کا سامان مہیا کرجائے تو کیا وہ زندگی میں اسے پسند کرے گا کہ اپنی صورت و سیرۃ تشبہ کے ذریعہ مشتبہ بنالے درانحالیکہ شرعاً و عرفاً مشتبہ صورت، مشتبہ کپڑا، مشتبہ پانی اور ہر مشتبہ چیز کسی حال میں بھی درخور التفات اور قابل اعتبار نہیں۔ پھر حیرت ہے کہ عام مسلمین کی سبیل اور راہ تو یہ ہے کہ وہ موت کے بعد بھی تشبہ بالاقوام سے بچنے کی سعی کریں تاکہ اجراء احکام اسلامی سے محروم نہ رہیں اور سید صاحب کی غیر سبیل المؤمنین یہ ہے کہ وہ زندگی میں بھی تشبہ بالاغیار کو لاحرج اور کالباس کی نذر کردیں تاکہ مسلم قوم پر اسلامی احکام کے بجائے کفر کے احکام کا اجراء ہوجائے۔ فما اصبرهم على النار ذلك بان الله نزل الكتب بالحق وان الذين اختلفوا في الكتاب لفي شقاق بعيد۔

بہرحال سید صاحب بیچ کر اس حدیث کا کوئی بھی محمل تجویز کرلیں خواہ موت زعام ہو یا حیاۃ بعام ہر صورت میں ترک تشبہ کا وجوا و روجوب اسی محمل سے نکل آئیگا اور وہ حدیث کو باتی ماننے کے بعد اسکی حقیقت (ترک تشبہ) کے دائرہ سے کبھی باہر نہ نکل سکیں گے۔ اور یہ پہلے ثابت ہوچکا ہے کہ اس حدیث کو باسعنی ماننا ناگزیر ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ اسلئے ہر صورت میں

ترک تشبہ کا وجوب بھی اس حدیث سے نمایاں ہوتا رہیگا ولو کرہ المنکرون۔

پس سید صاحب کی تمام وہ بحثیں جو حدیث من تشبہ کے خلاف انہوں نے اٹھائیں اپنے مقدمات کے لحاظ سے تو مسئلہ تشبہ کا ایک نامعقول ساز و کر رہی تھیں۔ لیکن نتیجہ کے لحاظ سے اس کا اثبات کرنے لگیں جو ہمارا عین مدعا تھا۔ پس جس کلام کا اول و آخر باہم ٹکرا رہا ہو آیا اس کلام کو مردود کہنا چاہیے یا اس حدیث من تشبہ کو جس کے خلاف یہ کلام اٹھایا گیا تھا۔

بہرحال واضح ہوگیا کہ حدیث من تشبہ فهو منهم ایک ایسا عقلی و نقلی اور حسی و شرعی قانون ہے کہ اس کی شرعی حیثیت پر مبطلون کی سفیہانہ کارروائیاں کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں اور کھل گیا کہ منکروں کی ناجائز نکتہ چینیاں اور بے جا اعتراضات محض ایک دھوکہ اور خدعہ تھے جنکا پردہ چاک ہوگیا اور حدیث بے غبار ہوکر اس طرح دکھلائی دینے لگی کہ نہ اسکی سند میں انقطاع ہے۔ نہ رواۃ میں ضعف ہے۔ نہ اسپر مورد متعین نہونے کا الزام عائد ہے نہ اس پر کسی شرعی نتیجہ کو مستلزم نہونیکا دھبہ ہے۔ نہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل آپ کے اس قول کے معارض ہے۔ نہ حضور اور صحابہ کا کوئی فعل اس کی شرعی حقیقت کے لئے مبطل ہے۔ نہ کسی چیز سے کفر لازم نہ آنا اس کیا مندرج حقیقت کو جائز کر سکتا ہو۔ نہ ظاہر کے باطن پر اثر نہ ڈالنے کا سفسطہ اسکی حقیقی تاثیرات کو فنا کر سکتا ہے۔ نہ وہ ایسی حقیقت مطلقہ ہے جسکی ایک آدھ ہی جزئی عملاً مطلوب ہو۔ نہ اس کا محل فقط صورت اور وہم ہی ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا واضح الدلالۃ۔ نتیجہ خیز۔ غیر متعارض۔ یقینی التاثیر۔ اور عام و تام شرعی اصول ہے جو نہ تو کسی عارض کے فرض کر لینے سے ہٹتا ہو۔ اور نہ کسی منکر کے انکار سے بگڑتا ہو۔ وہ خدا کے غیر متزلزل اور لاتبدیل کلام سے ثابت شدہ ایک حقیقت ہے جسمیں کسی محرف کی تحریف اور مبطل کے ابطال کو راہ نہیں مل سکتی۔

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔

نہ اس میں غیر واقعی بات آسکتی ہے اسکی آگے کی طرف سے اور نہ پیچھے کی طرف سے یہ خدائے حکیم و محمود کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

پس اگرچہ ہندوستان کے مشہور لیڈر اور مصلح ریفارمر سید صاحب نے اس حدیث رسول کو روایۃً

اور درایۃً مردود اور ناقابل عمل ٹھیرانے میں تہذیب الاخلاق کے کتنے ہی صفحات سیاہ کئے اور بے حد مساعی سے کام لیا لیکن اسی حدیث کے متعلق اُمتہ مرحومہ کے بے تعداد علما کی نکتہ سنجیوں اور ائمہ دین کی کتنی ہی بصیرۃ افزا حقائق کو سامنے رکھکر ہم سید موصوف کی ان تمام مساعی کو چند توہمات اور بعید از قیاس تخیلات سے زیادہ وقعت نہیں دیسکتے۔

وہ اس حدیث کے رد و تضعیف میں اگر کوئی وزنی اشکال پیش کرتے تو ممکن تھا کہ ہم بھی کسی مزید تفصیل سے کام لیتے لیکن صورت موجودہ میں ان مذکورہ شبہات و وساوس کی مقاومت کیلئے ہماری چند سطریں جو اس فصل میں پیش کیگئیں کافی اور ان کے تار عنکبوت کا طلسم کھولدینے کے لئے وافی ہیں۔

آخر میں ہم اپنا اظہار حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سید صاحب نے تو تشبّہ کے بارہ میں اپنی خود ساختہ اور دہ در دہ مشرب میں اسقدر وسیع الخیالی کا ثبوت دیا کہ یہود و نصاریٰ۔ ہنود و مجوس اور دنیا کی کوئی گم راہ قوم بھی اُن سے ناراض نہ رہ سکی۔ لیکن اسلام کے ربانیوں نے تشبّہ کے متعلق اپنا دائرہ عمل اتنا تنگ اور محدود بنالیا کہ وہ کفار تو کفار اہل بدعات کی بھی رضا و خوشنودی حاصل نکر سکے کیونکہ ان کا مسلک تو امام غزالی کی لسان میں یہ ہے کہ۔

مهما صارت السنة شعارًا لاهل البدعة قلنا بترکها خوفا من التشبه بهم۔ (احیاء العلوم کتاب السماع)۔

جبکہ کوئی سنت مبتدعین کا امتیازی شعار بنجائے تو ہم ایسی ان کے مشابہ بن جانے کے خوف سے اس کے بھی ترک کا فتویٰ دیں گے۔

کیونکہ ان کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ سنت پر عمل کرنا تو سنت ہی ہے لیکن تحفظ حدود فرض ہے اسلئے انہوں نے اس سنت کے ترک کا فتویٰ صادر کردیا جو مبتدعین کی جماعت کا امتیازی نشان قرار پا جائے اور اس امتیاز کا دامن سنبھال لیا جو اہل سنت و اہل بدعۃ کو الگ الگ نمایاں کردے اور ان میں سے اس مہلک تشابہ کا استیصال کردے۔

پس اس روایۃ سے ان اسلاف کرام کی تو انتہائی احتیاط کھلجاتی ہے کہ وہ مبتدعین کے تشبّہ سے

فصل

حدیث لا رہبانیۃ فی الاسلام

گذشتہ فصل میں جس قدر نکتہ چینیوں کے جواب دئے جا چکے وہ ایک نقض کی حیثیت رکھتی تھیں یعنی ان نکتہ چینیوں کے ذریعہ ترک تشبہ سے متعلق ہمارے پیش کردہ دلائل پر نقوض وارد کر کے ان کو مخدوش بنانے کی سعی کی گئی تھی۔ جو بحمد للہ باطل اور بے ہودہ ثابت ہوئی۔ اب ہم ایک ایسی نکتہ چینی کا جواب دینا چاہتے ہیں جو معارضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی جس کے ذریعہ نکتہ چینوں نے بجائے ہمارے دلائل کو منقوض کرنے کے ہمارے مدعا (ترک تشبہ) کے خلاف خود اپنی دلیل قائم کی ہے۔ اور یہ دکھلانا چاہا ہے کہ ترک تشبہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ایک ایسی غیر مشروع چیز ہے کہ جسکو خود شریعت نے رد کر دیا ہے۔

اس معارضہ کا حاصل یہ ہے کہ۔

ترک تشبہ سے تو سخت تنگی اور ضیق کی بنیاد پڑتی ہے۔ اسکی تعلیم سے تو اسلام کا وسیع دائرہ سمٹ جاتا ہے۔ ہر چیز پر حدود و قیود لگ جانے کی وجہ سے زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے بہت سے سامان بیکار ٹھہر جاتے ہیں۔ دنیا کی اقوام سے کسی اچھے اور مفید نظریہ سے استفادہ کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ اور ان حدود و قیود کی بدولت اسلامی قوم کی ترقی رک جاتی ہے۔ گویا رہبانوں کی طرح بہت ہی قلیل التعداد افراد رہ جاتے ہیں جو اس رہبانیت نما اصول (ترک تشبہ) کے ماتحت اسلام میں زندگی بسر کر سکیں۔ حالانکہ اسلام ایسی تنگیوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہے۔ اس نے تو اقوام عالم کو یسر اور سہولت کا پیغام سنا کر اس قسم کی تمام رہبانیت آمیز تنگیوں سے بچا لیا تھا اور اعلان دے دیا تھا کہ۔

لا رہبانیۃ فی الاسلام۔ | اسلام میں رہبانیت اور تنگی نہیں ہے۔

نکتہ چینوں پر بھی ہے اور اسلئے اس الزام کی جوابدہی تنہا ہمیں پر کیوں عائد کیجارہی ہے؟۔

	لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق	

حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے ہی دائرہ میں رہکر گفتگو کرنی چاہئے اور اسی فن میں محدود رہکر بولنا چاہئے جس کا وہ اہل بنایا گیا ہے۔

	ہر کسے را بہر کارے ساختند		میل او را در دلش انداختند	

مسئلہ تشبہ نہ تو کوئی سیاسی و اقتصادی مسئلہ ہے اور نہ موجودہ پالیٹکس سے اُسے کوئی تعلق ہی بلکہ وہ شریعت کا ایک سچا اور صاف مسئلہ ہے جو سیاستہ نبوۃ سے وجود پذیر ہوا ہے اسلئے اس کی تحقیق بھی اسمبلی کے رائے دہندوں اور کالجوں کے مؤسسین یا پروفیسروں کے بجائے صرف دائرہ شریعت کے ارکان یعنی ان علماء ہی سے کرنی چاہیئے جنہوں نے اپنی عمریں قرآن و سنت کے ذکر و فکر میں گذاریں اور آیات و احادیث کو اپنے اپنے محل پر جمع کرنے کی واقعی اہلیت اپنے اندر پیدا کی تعجب ہے کہ حدیث کا رَهبانیۃ سے کس طرح تشبہ کا مسئلہ باطل ٹھیرایا جارہا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث تو اپنے الفاظ و نظم اور معانی و حقائق کے اعتبار سے تشبہ کے مسئلہ کو نہ صرف نمایاں ہی کر رہی ہے بلکہ اس کے اثبات کی ایک نہایت ہی قوی اور محکم دلیل ہے۔ ہم بے حد مشکور ہیں اُن کے جنہوں نے مسئلہ تشبہ پر اس حدیث سے اعتراض کر کے ہمیں اس مسئلہ کے ثابت کرنے میں مدد دی اور ایک مستقل دلیل کی طرف ہماری توجہ کو پھیر دیا۔

حدیث مذکور کی غرض تو آپ کے نزدیک بھی یہی ہے کہ دین میں حد سے گذرا ہوا تشدد اور زاہدانہ کاوش نہیں ہے۔ لیکن اسپر غور کرو کہ حدیث کے حکمت آمیز نظم نے یہاں دینی غلو اور مذہبی تشدد کو ان صاف اور صریح الفاظ میں تو نہ روکا کہ "لوگو! دین میں تشدد مت کرو" بلکہ تشدد کی نفی کی تو ان الفاظ میں کی کہ لَارَهبانیۃ فی الاسلام (لوگو اسلام میں رہبانیت نہیں ہے) ۔ حالانکہ اس مقصد کو جتلانے کیلئے پہلا جملہ زیادہ صاف و صریح تھا۔ پھر ایسا کیوں کیا گیا؟ اسلئے کہ مذہبی تشدد کی ممانعت کے ساتھ ساتھ یہاں اسکے بُرائی کی حقیقی علت پر بھی متنبہ کرنا منظور تھا کہ وہ صرف

کفر خود در اسے خود در عالم رندی نیست — کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(۳) پھر عاشق کے تمام وہ جذبات و مرضیات جو سلطان عشق نے چھین لئے تھے سب کے سب محبوب کے عزائم و مرضیات میں فنا ہو جاتے ہیں کیونکہ عاشق کے قلب و دماغ یعنی عزائم و افکار پر محبوب چھا جاتا اور عاشق کے کل افعال خود اسکی مرضی سے ظہور پذیر ہونے کے بجائے محبوب کی مرضی سے سرزد ہونے لگتے ہیں۔ اور اسکی زندگی و موت سب محبوب کے لئے ہو جاتی ہے۔

از زندگیٔ عطائے تو در کشتی فدائے تو — دل شد و مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(۴) پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس انہماک محبت اور استغراق عشق میں عاشق کو ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا بلکہ اسکی ہر ایک آن و بان اور ساری ادائیں حتیٰ کہ اسکے تمام متعلقات و منسوبات یہاں تک کہ اس کے کوچہ کی در و دیوار تک محبوب اور جاذب دل بن جاتی ہیں۔

أمرّ علی الدیار دیار لیلی — أقبّل ذا الجدار و ذا الجدار
و ما حبّ الدیار شغفن قلبی — و لکن حبّ من سکن الدیار

(۵) پھر یہی وہ محبت صادقہ ہے کہ جس کے رسوخ و استحکام کے بعد دنیا کی کوئی طاقت عاشق کو خلاف راہ عشق کسی جنبش میں نہیں لا سکتی یعنی نہ اس کے جذبات محبت میں کسی ناصح کی نصیحت سے کمی آسکتی ہے اور نہ کسی لائم کی ملامت سے کوئی تذبذب۔ بلکہ یہ نصیحت و ملامت اور زیادہ اسکے عشق کو بھڑکا دیتی اور وہ اس وارفتگی اور بے ساختگی کا زیادہ سے زیادہ طلبگار ہو جاتا ہے۔

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات — ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشی

عاشق کی یہ خود گذاری یا ترک خودی اسکی تفویض و تسلیم پھر ترک ماسویٰ یا غیر محبوب سے استغنا اُس ادعائی عشق و محبت کے افسانے ہیں جسمیں نہ دوام ہے نہ استقلال نہ بقا ہے نہ قرار۔ محب بھی چند روزہ ہے اور محبوب بھی عارضی۔ محب کا عشق بھی زائل ہے اور محبوب کا جمال بھی فانی تو پھر ہی بتلاؤ کہ اگر کوئی اپنا دل ...

؎ مجنوں کہتا ہے کہ میں لیلیٰ کے کوچہ پر گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو۔ اور میرے دل میں اصل کوچہ کی در و دیوار سے کوئی محبت نہیں بنایا بلکہ اس کوچہ کی رہنے والی نے دراسکی وجہ سے یہ متعلقات بھی دل میں گھر کر گئے۔ ۱۲

آیت کریمہ میں مطیعوں اور عاشقوں کو صفت ایمان کے ساتھ مؤمن اور مؤمنہ ذکر فرماکر سلب اختیار اور سلب آزادی کو اُس پر متفرع کرنے سے یہی ظاہر کرنا منظور ہو کہ ایمان عشق حق کا نام ہو اور عشق میں عاشق کی آزادی باقی رہنی قدرتی طور پر ناممکن ہو اور پھر اسی آیت میں خود رائی کو عصیان سے تعبیر فرماکر یہ ظاہر کیا گیا ہو کہ حکم الٰہی آجانے کے بعد اپنی تجویز کا دخل دینا ایمان کی کمزوری اور عشق کی خامی کی دلیل ہو۔

تفویض و تسلیم | پھر دوسری وہ کیفیت جس کو ترک خودی کے بعد عاشق محسوس کرتا ہو یہ ہے کہ مؤمن کے یہ تمام سلب شدہ اختیارات و مرضیات محبوب حقیقی کی مرضیات و اختیارات میں فنا اور متلاشی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اسپر جب سے اُس کے نفس کے حق ہی حق چھا جاتا ہو وہ کرتا ہے تو اُس کے لئے اور رکتا ہو تو اُسکے لئے جیتا ہو تو اُس کے لئے اور مرتا ہے تو اُس کیلئے اُس کی عادات بھی اُسی کے لئے ہو جاتی ہیں اور عبادات بھی اُسی کیلئے۔ غرض تفویض مطلق اور تسلیم محض اُس کا امتیازی شعار بنجاتی ہے۔ یہی وہ مقام جان سپاری ہو جسکو شریعت اپنی اصطلاح میں اسلام کہتی ہو۔ حضرت حق نے ابراہیم علیہ السلام سے اسی اسلام و استسلام کو اسلم کہکر طلب کیا اور پھر اُن سے اسی عنوان کی حقیقت کا یہ کہکر ایک عملی اقرار لیا تھا کہ۔

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہ رب العلمین لا شریک لہ و بذالک امرت وانا اول المسلمین ۔

(اے) ابراہیم کہدو کہ میری نماز اور میرا حج اور میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا امر کیا گیا ہو اور میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔

پھر اسی مقام کو اللہ نے اپنے آخری نبی کی زبان پر ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ۔

من اعطی للّٰہ و منع للّٰہ و احب للّٰہ و ابغض للّٰہ فقد استکمل الایمان (مشکوٰۃ)۔

جس نے اللہ ہی کیلئے دیا اور اسی کیلئے روکا اور اسی کیلئے محبت کی اور اسی کیلئے عداوت باندھی تو بیشک اُس نے ایمان کامل کرلیا۔

یہی وہ مقام ہو جسکی استدعا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان دعائیہ کلمات میں فرمائی ہو کہ۔

اللّٰھم احفظنی بالاسلام قائما و احفظنی بالاسلام قاعدا و احفظنی بالاسلام راقدا ۔

اے اللہ میری حفاظت اسلام سے فرما کھڑے اور بیٹھے اور سوتے ہوئے۔

• گویا اسی درجہ کو حضور نے ان الفاظ میں مانگا ہو کہ۔

اوحی اللہ الی نبی من الانبیاء اَنْ قل لقومك لا یدخلوا مداخل اعدائی ولا یلبسوا ملابس اعدائی ولا یرکبوا مراکب اعدائی ولا یطعموا مطاعم اعدائی فیکونوا اعدائی کما ھم اعدائی (الزواجر صفحہ جلد اول)	خدا نے انبیاء میں سے ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم سے کہہ دو کہ وہ میرے دشمنوں کے گھسنے کی جگہوں سے گھسیں بھی نہیں اور میرے دشمنوں کا سا لباس بھی نہ پہنیں اور میرے دشمنوں کے کھانوں جیسے کھانے بھی نہ کھائیں اور میرے دشمنوں کی سواریوں جیسی سواریوں پر سوار بھی نہ ہوں۔

یعنی ان میں سے ہر چیز میں کسی امتیازی شان پیدا کریں اور امتیاز سب سے بہتر اس طریقہ سے ہو جائیگا جو سنت نبوی ہو تاکہ کہیں وہ بھی ان دشمنوں کی طرح میرے دشمن نہ بن جائیں۔

اس وحی کے آخر کا یہ جملہ فیکونوا اعدائی کما ھم اعدائی (کہیں وہ بھی ان دشمنوں کی طرح میرے دشمن نہ بن جائیں) ایسا ہی ہے جیسے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو کفار کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کی ممانعت فرما کر کہا تھا کہ اگر تم ان کے ساتھ بیٹھے اٹھے تو انکم اذاً مثلھم (سو اس وقت تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے) یا قرآن کریم نے کفار کی دوستی اور موالات قطع فرمانے کو حکم دیکر کہا ہے کہ ومن یتولھم منکم فانہ منھم (اور جو تم میں سے ان کی دوستی کریگا تو وہ انہیں میں سے شمار ہوگا) یا حدیث نبوی نے مشابہت کفار سے روک کر فرمایا کہ من تشبہ بقوم فھو منھم (جو کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کریگا تو وہ اسی قوم میں سے ہو جائیگا)۔

شغف حُب اور جب دو مرکزی چیزیں یعنی انہماک عشق اور استغراق فی المحبوب میں شغف پیدا ہوتا ہے تو پھر ایک ذات محبوب ہی محبوب نہیں رہتی بلکہ محبوب کے اوصاف، اسکے احوال، اسکے افعال حتیٰ کہ اسکے تمام منسوبات بھی اسکی خاطر سے دل میں محبوب ٹھہر جاتے ہیں۔ یہی رنگ حضرت حق تعالیٰ اور بارگاہ نبوت کی محبت ایمانی قلوب میں بالآخر پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے ہر اس چیز کی الفت بھی جم جاتی ہے جو حق سے کوئی نسبت رکھتی ہو۔ خواہ وہ حقانی اشخاص ہوں یا حقانی اعمال، حقانی علوم ہوں یا حقانی شعائر، حقانی اوضاع و اطوار ہوں یا حقانی رسوم و حقائق۔

اسی شغف حب کے مقام کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس دعا میں مانگا ہے کہ۔

اللّٰھم انی اسئلك حبك وحب من یحبك	اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری محبت اور اس

اظهرت دینا قد علمت بانه	من خیر ادیان البریة دینا
لولا الملامة او حذار مسبة	لوجدتنی سمحا بذاک مبینا

پھر کون ہے کہ ابوطالب کو مومن صادق یا عاشق حقیقت کہنے کی جرأت کرے۔ ہاں عشاق حقیقت کی شان یہ ہے کہ وہ محبوب کے حقیقی معاملہ میں کسی طعن وتحقیر کی نیم جو کی برابر بھی پرواہ نہیں رکھتے اور ایسی ملامتوں کو نوک پاپوش سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ حضرت حذیفہ ابن یمان کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے لقمہ گر پڑا تو انھوں نے اٹھا کر صاف کیا اور موتھ میں رکھ لیا۔ ایک خادم نے عرض کیا کہ ایسا نہ کیجئے عجمیوں میں یہ طریقہ معیوب ہے اور وہ ایسے شخص کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو برہم ہو کر فرمایا۔

أأترك سنة حبيبي لهؤلاء الحمقاء ۔	کیا میں اپنے محبوب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں گا؟

پس اہل ہوا کے طعن وتحقیر سے کسی سچائی اور پاکبازی کو چھوڑ دینا تو ابوطالب کا شیوہ ہے اور ساری دنیا کی ملامتوں کے جہرمٹ میں حق کے سامنے گردن ڈالدینا حضرت حذیفہ کی، اور ظاہر ہے کہ اپنے نمونے کے لئے حضرت حذیفہ کا اسوہ تو قابل تقلید ہو سکتا ہے لیکن ابوطالب کا نقش قدم کسی طرح نشان راہ نہیں بن سکتا۔

اور اگر وہ اسلئے تشبہ بالنصاری پر رضامند اور قناعت پذیر تھا کہ انہوں نے دنیا کی سب سے بڑی پُرہیبت اور حکمران قوم سے تشبہ کیا ہے تو انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا سے بڑھکر مذہب کی کوئی حکمرانی اور ہستی نہیں۔ یہ آسمانی بادشاہت جب ظہور کرتی ہے تو تمام زمینی حکمرانیاں اسکے سامنے سربسجود ہو جاتی ہیں اور یہ سلطنت جب چودہ صدی پیشتر پھٹے پرانے کپڑوں شکستہ حجروں اور ظاہری بے سروسامانیوں کے ساتھ [illegible] ظاہر ہوئی تو دیکھئے کہ [illegible] دنیا کی حکمرانیوں کے نقشے بدل دیئے۔ فارس کا زریں تخت قیصر کا [illegible] ہوا تاج [illegible] قوموں کو زیر و زبر کر دیا [illegible] سامان [illegible] رشک قرون [illegible] ہیں۔

[illegible]

تجو بہ محمل نشا بن کہ در ولایت عشق — گدا بہ تخت نشانند و پادشہ گیرند

پس کیا ایک ثبوتی کی بارگاہ کا عاشق اور مدعیٔ محبت بھی کسی سلطنت کی چوکھٹ پر سر نیاز جھکا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ تو غیر کی طرف پورا التفات ہے حالانکہ ولایت عشق کا پہلا قانون تو غیر کے خیال کو بھی دل سے محو کر دینا ہے، چہ جائیکہ غیر پر اوندھا ہو جانا۔

اور اگر وہ اسلئے غیر اقوام کی ہو بہو پیروی کر رہے ہیں کہ ان کے معمولات و مصنوعات میں کچھ مادی منفعتیں اور معاشرتی راحتیں بھی انھیں نظر آ رہی ہیں اور ظاہری زینتیں بھی، تو انھیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہر وہ چیز جو کسی منفعت پر مشتمل ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ مباح بھی ہو۔ شراب اور قمار بازی میں بھی منفعتیں ہیں اور وہ کہ جن کا قرآن کو بھی اقرار ہے پھر عموماً عالم کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو مضر محض ہو اور کسی منفعت پر بھی مشتمل نہ ہو۔ لیکن پھر بھی ان دونوں چیزوں اور دوسری بہت سی اشیاء کو قرآن نے حرام قرار دیا اور اسلئے قرار دیا کہ انکی مضرتیں اور بالخصوص روحانی مضرتیں انکے منافع پر غالب تھیں پس مطلقاً منفعت کسی شے کیلئے موجب استعمال نہیں بن سکتی۔ رہی زینت تو اول تو عاشق کو زینت اور بناوٹ سے کیا سروکار، اسے بناؤ سنگار اور فیشن کی غلامی سے کیا واسطہ؟ اور اسکو خرقہائے اختراع و ثیابِ نو سے کیا علاقہ ع

اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

عاشق کو تو جامہ دوزی کے بجائے جامہ سوزی ملی ہے۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن — پروانہ زمن، شمع زمن، گل زمن آموخت

اور اگر اسے تجمل ہی محبوب ہے تو پھر عشق کے ہوتے ہوئے محبوب ہی کا تجمل محبوب ہو سکتا ہے نہ کہ اغیار کا بلکہ اعداء کا۔

بہر حال دعوائے عشق اور ادعائے ایمان رکھتے ہوئے یہ تمام اعذار بارد محض لچر اور حیلہ جوئی ہی حقیقت تو یہ ہے کہ زمانہ کو جہل و فساد نے گھیر لیا، قلوب منحرف ہو گئے ایمان اور ایمانی اشیاء سے منافرت اور اطوار سلیمہ سے اجنبیت دلوں میں بیٹھ گئی۔ اس لئے سبیل المؤمنین پر چلنے کی توفیق بھی چھن گئی یہ تلمیحات، اعذار اور حیلے محض اسلئے ہیں کہ اس بے توفیقی کے عیب پر پردہ ڈالدیا جائے، ورنہ اگر